یعنے

حضرت مولوی ظفر علی خان صاحب کی تازہ تالیف

جس میں

ادبیات اردو (لٹریچر) کے بہترین معجزات ہیں
مختلف دلکش و دل آویز افسانوں کے پیرائے میں
موجودہ معاشرتی مسائل کے شگفتہ و شاندار مناظر دکھائے
ہیں، اور اعجاز تحریر کے بدیع المثال نظارے پیش کئے ہیں

سنہ ۱۹۲۵ء

منصور سٹیم پریس لاہور میں باہتمام لال شاہ پرنٹر و پبلشر چھپا

دوم

تعداد طبع ۱۰۰۰

ڈاکٹر ہیڈگر ایک معمّر بزرگ تھے۔ جن کی ساری عمر کیمیائی تجربوں اور مسمریزم کے پُراسرار دقائق کی چھان بین میں گزری تھی۔ ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے چار احباب کو جو سن رسیدگی کے لحاظ سے اُن کے خاص الخاص ہم جنسوں میں داخل تھے۔ چائے کی دعوت پر بُلایا۔ اُن میں سے تین تو جنٹلمین تھے۔ اور ایک لیڈی صاحبہ تھیں جو مدت ہوئی۔ کہ اپنے شوہر کو مٹی دے چکی تھیں۔ جنٹلمینوں میں سے ایک کا نام مسٹر ڈبرن تھا۔ ایک کا کرنیل کلیگرو اور ایک کا مسٹر گسکان۔ لیڈی صاحبہ کو مسز وچرلی کہتے تھے۔ ان چاروں کے چاروں کی شبیہیں صورت گرانِ قضا و قدر نے حسرت و ناکامی کے مرقع میں کھینچی تھیں۔ اور ان کی سب سے بڑی کم نصیبی یہ تھی۔ کہ کنجِ لحد میں ان کے لئے وہ گنجائش جو سالہا سال پہلے نکل آنی چاہیے تھی اب تک نہ نکلی تھی۔ جوانی کے دنوں میں مسٹر ڈبرن ایک بہت بڑے دولتمند تاجر تھے۔ لیکن شامتِ اعمال سے آپ نے اپنی ساری پونجی ایک مخدوش تجارتی منصوبے میں لگا دی۔ جس نے آپ کا

دیوالہ نکال دیا۔ اور آپ تماشاگاہ عالم میں بیک بینی و دوگوش جوتیاں چٹخاتے رہ گئے کرنیل صاحب کو بھی عالم شباب میں مبداء فیاض نے دولت و صحت کے انعامات سے مالا مال کر رکھا تھا۔ لیکن آپ کی وارستہ مزاجی نے ان دونوں نعمتوں کی کوئی قدر نہ کی بلکہ ان کو بہت سے بے لذت اور بالذت گناہوں کی نذر کر دیا۔ جس کا خمیازہ آپ کو عہد پیری میں نقرس وجع مفاصل و دیگر آلام جانفرسا کھینچنا پڑا۔ مسٹر گسکان نے اپنی عمر عزیز کا بہترین حصہ پولٹیکل بدنامیوں کے خرمن کی خوشہ چینی میں صرف کیا تھا۔ اور گو نصف صدی پیشتر آپ اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے بہت کچھ مشہور تھے۔ لیکن اس ناقابل رشک شہرت کی لاش آجکل گمنامی کے کفن میں لپٹی ہوئی تھی۔ باقی رہ گئیں بیوہ صاحبہ۔ سو ان کی نسبت قدیم روایات سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ رنگین مزاج حلقوں میں ان کے حسن کے بہت کچھ چرچے رہا کرتے تھے۔ اور ان کی ناز آفرینیاں اور کرشمہ سازیاں بہت سے دلوں میں چٹکیاں لیا کرتی تھیں۔ لیکن باوجود اس آزادی کے جو طبقہ نسواں کو یورپ میں میسر ہے۔ عہد شباب کے بہت سے ناگفتہ بہ واقعات کی گرد شہرت نے مسز وچرلی کے دامن کو اس درجہ آلودہ کر دیا تھا۔ کہ وہ چند سال سے کنج تنہائی کو اپنا مونس سمجھنے لگ گئی تھیں۔ اس مقام پر یہ بیان کر دینا خالی از لطف نہ ہوگا۔ کہ وہ تینوں سالخوردہ بزرگوار جن سے ناظرین کو روشناس کرایا جا چکا ہے۔ اُس زمانہ میں جب ان کے خون کی حرارت اور روانی بڑھی ہوئی تھی۔ مسز وچرلی کے حلقۂ عشاق میں داخل تھے۔ اور دلفریب بیوہ کی خاطر ایک دوسرے سے کئی دفعہ دست و گریبان ہو چکے تھے۔

اپنے چاروں مہمانوں کو ڈاکٹر ہیڈگر نے اپنے کتب خانے میں لے جا کر بٹھایا۔ اس کتب خانے کی نسبت اگر وہ تمام قصے صحیح ہوں۔ جو لوگوں کی نوک زبان تھے۔ تو کتبخانہ کیا تھا اچھا خاصا طلسم ہوشربا تھا۔ کمرے کی چھت پر مکڑیوں کی بہت سی نسلوں نے جالے پور رکھے تھے۔ دیواروں پر خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ تو ساٹھ ستر سال سے پرانی گرد

نہ جمی ہوگی۔ چاروں طرف الماریاں رکھی ہوئی تھیں۔ جن میں لاطینی اور عبرانی زبان کے قدیم
مجلد قلمی نسخے بند تھے۔ ایک الماری پر حکیم بقراط کا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ اور بعض لوگوں کا بیان
تھا۔ کہ ڈاکٹر ہیڈگر ہر مشکل مسئلہ میں اس مجسمہ سے صلاح و مشورہ لیا کرتے ہیں۔ کمرے کے
ایک تاریک کونے میں ایک عجیب وضع کی الماری کھڑی تھی۔ جس کا ایک پٹ کھلا
تھا۔ اور کھلے پٹ میں سے ایک انسانی ڈھانچ کی ڈراؤنی صورت نظر آ رہی تھی۔ دیوار
کے ایک حصہ پر ایک قد آدم آئینہ لٹکا ہوا تھا۔ اور اُس آئینہ کی نسبت منجملہ دوسری بہت
سی عجیب و غریب روایتوں کے ایک قصہ یہ مشہور تھا۔ کہ اُن تمام بیماروں کی روحیں
جو بہ زمانۂ حیات ڈاکٹر ہیڈگر کے زیر علاج رہ چکے تھے اُس آئینہ میں بند تھیں۔ اور ڈاکٹر
صاحب کی نظر جب آئینہ پر پڑتی تھی تو انہیں تاکا کرتی تھیں۔ دیوار کے اس حصہ پر جو آئینہ
کے مقابل تھا۔ لباس حریری میں ایک قبول صورت نوعمر لیڈی کی تصویر آویزاں تھی۔
پچاس سال سے اوپر ہونے کو آتے ہیں۔ کہ ڈاکٹر ہیڈگر کا اس لیڈی سے نکاح ہونے
والا تھا۔ لیکن دولہا دُلہن گرجے جانے کی تیاریاں کر ہی رہے تھے۔ کہ دُلہن کا
مزاج یکایک بگڑ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی معشوقہ دلنواز کے لئے نسخہ تجویز کیا۔
جسے پیتے ہی وہ بیچاری لڑھک گئی۔ کتب خانہ کے عجائبات میں جس عجوبہ کا ذکر شاید
سب ضروری ہے۔ وہ ایک نہایت ہی ضخیم و جسیم کالی جلد کی کتاب تھی۔ جو جادو
ل کتاب کے نام سے عوام میں مشہور تھی۔ چنانچہ لوگوں کا بیان تھا۔ کہ ایک مرتبہ
نب ڈاکٹر صاحب کی خادمہ نے اس کتاب کو گرد جھاڑنے کے لئے اٹھایا۔ تو دفعتہً
لماری والے ڈھانچ کی ہڈیاں کھڑکھڑا اٹھیں۔ نوعمر لیڈی کی تصویر چوکھٹے میں سے
یک قدم باہر نکل آئی۔ آئینہ میں سے بہت سے ڈراؤنے اور بھیانک چہرے سر
ہر نکال کر جھانکنے لگے۔ اور بقراط کا برنجی مجسمہ تیوری چڑھا کر سخت لہجہ میں پکارا۔ کہ
خبردار جو اسے چھوا!" میزبان و مہمان آبنوس کی ایک گول میز کے گرد

بیٹھ گئے۔ چاء کے سامان کے علاوہ میز کے وسط میں بلور کی ایک خوشنما صراحی شمپین کے چار گلاسوں کے ساتھ رکھی ہوئی تھی۔ کتب خانے کے مقابل دریچے میں سے جس پر ایک رنگین پردہ پڑا ہوا تھا۔ سورج کی کرنیں جب چھن چھن کر اس صراحی پر پڑتی تھیں۔ تو ایک حلقۂ نور پیدا ہو جاتا تھا۔ جس کی روشنی میں بڑھاپے کے اس مخمس کی تقطیع جو گول میز کے حاشیہ پر مرقوم تھا۔ اچھی طرح ہو سکتی تھی۔

جب چاء کا دور ختم ہو چکا۔ تو ڈاکٹر ہیڈگر نے اپنے چاروں دوستوں سے کہا کہ میں آج ایک نہایت ہی دلچسپ تجربہ کرنا چاہتا ہوں جس میں مجھے آپ صاحبوں سے مدد لینی ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ فقرہ سن کر چاروں کو معاً یہ گمان ہوا۔ کہ یہ شخص حسب معمول یا تو مرتبان میں سے ہوا خارج کر کے کسی چوہے کو اُس کے اندر بند کر دیگا اور آکسیجن کی جانفزا خاصیتوں پر لکچر دے گا۔ یا خردبین میں سے مکڑی کے جالے کے تار کی بناوٹ دکھائے گا۔ یا اسی قسم کی کوئی اور بیش پا افتادہ علمی لغویت کرے گا۔ لیکن جواب کا انتظار کئے بغیر ڈاکٹر ہیڈگر صاحب لنگڑاتے لنگڑاتے گئے۔ اور کالی جلد کی وہ کتاب اُٹھا لائے۔ جو عام طور پر جادو کی کتاب کے نام سے مشہور تھی۔ کتاب کھول کر اُنہوں نے اس کے اوراق میں سے ایک گلاب کا پھول نکالا۔ جس کے پچکے ہوئے سبز پتوں اور سُرخ پنکھڑیوں کو زمانہ کے انقلاب نے بھورا کر دیا تھا۔ اور جس کی کہنگی اور فرسودگی صاف کہے دیتی تھی۔ کہ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھوں کی ایک خفیف سی جنبش سے بھی یہ پھول پس کر سرمہ ہو جائیگا۔

ڈاکٹر صاحب نے مُرجھائے ہوئے اور فرسودہ پھول پر ایک حسرت بازنگاہ ڈالی۔ پھر ایک آہ سرد بھر کر کہا۔ کہ پچپن سال ہوتے ہیں۔ جب کلی بن کر یہ پھول چٹکا تھا۔ اور سلویا نے جس کی تصویر وہ سامنے دیوار پر لٹکی ہوئی ہے۔ اپنی نورانی انگلیوں سے اسے میرے کوٹ کے کالر کے کاج میں لگایا تھا۔ لیکن

آہ چرخ نیلوفری کی ایک گردش سے نہ پھول والی رہی نہ پھول رہا۔ پورے پچپن برس سے اس پھول کی پتیاں اس کتاب میں دبی ہوئی ہیں۔ کیا آپ لوگوں کی دانست میں یہ بات ممکن ہے۔ کہ یہ پھول از سرِ نو تازہ و شگفتہ ہو جائے۔ مسز وچر نے اپنے دیرینہ سال سر کو ایک حقارت آمیز جنبش دے کر اس سوال کے جواب میں کہا۔ کہ ڈاکٹر کیا لغو باتیں کرتے ہو۔ یہی کیوں نہ پوچھا کہ بڑھیا کا جوان ہو جانا بھی ممکن ہے یا نہیں ؟ ڈاکٹر ہیڈگر نے صراحی کا ڈھکنا کھول کر مرجھائے ہوئے پھول کو اس پانی میں جس سے یہ لبالب بھری ہوئی تھی ڈال دیا۔ کچھ دیر تک تو پھول سطح آب پر تیرتا رہا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ پانی کی نمی کو اس کی رگوں اور ریشوں نے جذب نہیں کیا لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ ایک عجیب و غریب تبدیلی اس میں نمودار ہونی شروع ہوئی۔ دبی اور سوکھی ہوئی پنکھڑیاں جنبش میں آئیں۔ ان کی رنگت ارغوانی ہوتی چلی۔ ڈنڈی اور پتے سبز ہو گئے موت زندگی سے بدل گئی۔ اور نصف صدی کا پرانا گلاب ویسا ہی شاداب اور تر و تازہ نظر آنے لگا۔ جیسا اس وقت نظر آیا تھا۔ جب سلویا نے اول اول اسے اپنے عاشق کی نذر کیا تھا۔ یہ اچھی طرح کھلا بھی نہ تھا۔ بلکہ اس میں ابھی تک غنچہ کی دوشیزگی کا جلوہ نظر آتا تھا۔ اس لئے کہ اس کی بعض نازک پنکھڑیاں ابھی تک اس کے عرق آلود دامن میں اپنا سر چھپائے ہوئے تھیں۔ جس میں شبنم کے دو تین قطرے موتی بن کر چمک رہے تھے۔ چونکہ اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب بھان متی کے کرتب ڈاکٹر ہیڈگر کے دوستوں کے دیکھنے میں آ چکے تھے اس لئے انہوں نے مردہ پھول کے دوبارہ زندہ ہو جانے پر کچھ زیادہ تعجب ظاہر نہ کیا۔ البتہ یک زبان ہو کر اتنا کہا۔ کہ بڑی اچھی نظر بندی ہے۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ اس کی ترکیب کیا ہے ؟

ڈاکٹر ہیڈگر۔ کیا تم نے چشمۂ جوانی کا نام نہیں سُنا۔ جس کی تلاش میں آج سے دو تین سو سال پہلے ہسپانیہ کا ایک سیاح نکلا تھا۔

مسز وچرلی۔ سُنا تو ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اُس سیاح کو اس چشمہ کا سراغ بھی ملا تھا یا نہیں؟

ڈاکٹر ہیڈگر۔ اُس کو تو نہ ملا۔ اس لئے کہ وہ اُس جگہ جا ہی نہ سکا جہاں چشمہ تھا۔ البتہ میرے ایک دوست نے اس چشمہ کو ڈھونڈ نکالا۔ جوانی کا یہ مشہور و معروف چشمہ جزیرہ نمائے فلاریڈا میں خلیج میکاکو کے قریب واقع ہے۔ جو درخت اور پھولوں کے پودے اس کے کنارے اُگے ہوئے ہیں۔ وہ اگرچہ صدہا سال پُرانے ہیں لیکن ان کی شادابی و تروتازگی کی یہ کیفیت ہے۔ کہ گویا خلعتِ شباب انہوں نے ابھی ابھی پہنا ہے۔ جس کی وجہ بجز اس عجیب و غریب پانی کی جان بخش و جانفزا خاصیت کے اور کچھ نہیں۔ میرے اس دوست کو چونکہ معلوم تھا۔ کہ میں ان معاملات میں بہت دلچسپی لیتا ہوں۔ لہذا اُس نے یہ قرابہ جو آپ کے سامنے رکھا ہے۔ اس حیرت انگیز پانی سے بھر کر میرے پاس بھیجدیا۔

کرنیل کلیگرو (ڈاکٹر ہیڈگر کے بیان کو از سرتاپا غلط اور لغو سمجھ کر تمسخر آمیز شک کے لہجہ میں) نباتات پر تو اس کا یہ اثر ہوا۔ لیکن یہ تو ارشاد ہو۔ کہ انسان کے جسم پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ہیڈگر۔ مشفق من اس کا اندازہ آپ خود فرما سکتے ہیں۔ بلکہ آپ چاروں یارانِ نکتہ داں کو میں صلائے عام دیتا ہوں کہ اس قرابہ جاں پرور میں سے جس قدر آپ کے بڑھاپے کو جوانی سے بدل سکے بلا تکلف نوش فرمایئے۔ میں خود بھی اس آبِ شباب کی مدد سے میدانِ زندگانی میں چالیس سال اُلٹی زقند بھرنے کی آپ کے ساتھ مشق کرتا۔ لیکن چونکہ خدا خدا کر کے میں بڈھا ہوا ہوں۔

اور اس منزل کے طے کرنے میں مجھے بڑی بڑی مصیبتیں پیش آئی ہیں۔ اس لئے عہد شباب کی طرف رجعت قہقری کرتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ کہ کہیں قدم قدم پر نئی منزل کا پھر سامنا نہ ہو۔

یہ ترشے ہوئے فقرے ڈاکٹر صاحب استعمال کرتے جاتے تھے۔ اور ساتھ ہی چشمہ جوانی کے پانی سے شمپین کے گلاس بھرتے جاتے تھے۔ سوڈا واٹر کی طرح اس پانی میں بھی کوئی گاس ملی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ ننھے ننھے بلبلے گلاسوں کی تہ سے برابر اٹھ رہے تھے جو سطح پر آکر پھٹ جاتے تھے۔ اور ایک نقرئی پھوار کی کیفیت پیدا کر دیتے تھے۔ یہ پانی خوشبودار بھی تھا۔ اس لئے بڑھیا کو اور تینوں بڈھ کو باوجود اس قطعی شک کے جو انہیں اس کی شباب آور خاصیتوں کی نسبت تھا یہ خیال ہو چلا۔ کہ کم از کم یہ مفرح اور خوش گوار ضرور ہے۔ اسی لئے انہوں نے بلا تامل اسے پی جانا چاہا۔ لیکن ڈاکٹر ہیڈگر نے ساقی گری کی خدمت انجام دینے سے پہلے ان سے کہا۔ کہ آپ اس آب حیات کو پیتے تو ہیں۔ لیکن یہ واضح رہے کہ ایک دفعہ تو آپ پوری زندگی کا تجربہ حاصل کر چکے ہیں۔ اور چونکہ اب آپ دوبارہ شباب کی پرخطر وادی میں قدم رکھنے لگے ہیں۔ لہذا مناسب ہوگا۔ کہ اس تجربہ کو اپنا رہنما قرار دے کر آپ چند اصول مرتب کریں۔ جن پر اس پرخطر سفر کو دوبارہ طے کرتے وقت آپ کاربند ہو سکیں۔ خیال کیجئے کہ یہ کس درجہ شرم اور گناہ کی بات ہوگی۔ کہ باوجود اس تفوق کے جو آپ کو دوسرے انسانوں پر حاصل ہونے والا ہے۔ آپ اس نسل کے تمام نوجوانوں کے لئے پاکبازی اور دانشمندی کی زندہ نظیر نہ بن سکیں۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ بات بھی آپ کو جتلائے دیتا ہوں کہ ان اصول پر آپ نے عمل نہ کیا۔ تو آپ جوانی کا اثر بالکل زائل ہو جائیگا۔

ڈاکٹر صاحب کے چاروں دیرینہ سال احباب نے اس سوال کا جواب بجز

اس کے اور کچھ نہ دیا۔ کہ از راہِ تمسخر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اس لئے کہ اس سے زیادہ اور کوئی بات اُس وقت اُنہیں مضحکہ انگیز نہ معلوم ہوئی۔ کہ باوجود اس بات سے اچھی طرح واقف ہونے کے کہ استغفار معصیت کے نقش قدم پر چلتا ہے۔ اور ندامت گناہ کی جاروب کش ہے۔ اُن سے پھر بھی کبھی کوئی خطا سرزد ہو گی۔

غرض انہوں نے ایک ساتھ گلاس اُٹھائے اور ایک گھونٹ میں آبِ جوانی کو پی گئے۔ اس پانی میں اگر فی الحقیقت وہ خاصیتیں موجود تھیں۔ جن کا ذکر ڈاکٹر ہیڈگر نے کیا تھا۔ تو ان چاروں سے زیادہ ضرورت پردۂ دنیا پر اور کسی انسان کو اس کی نہ ہو سکتی تھی۔ اس لئے کہ ان کی مُرجھائی ہوئی فلاکت زدہ اور بے آب و رنگ صورتیں دیکھ کر کسی کو یہ گمان نہ ہو سکتا تھا۔ کہ کبھی یہ بھی جوانی کی خوشبوؤں سے بہرہ اندوز ہوئے ہونگے بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ یہ قدرت کے بڑھاپے کی اولاد ہیں۔ جو ہمیشہ ہی سے ایسے منحوس اور فرسودہ اور درماندہ تھے۔ اور جن کے جسم ناتواں میں اتنی جان بھی باقی نہیں کہ دوبارہ جوان ہونے کی اُمید بھی اسے حرکت میں لا سکے۔

گلاس خالی کر کے انہوں نے میز پر رکھ دیئے۔ ڈاکٹر ہیڈگر کا دعوے نادرست نہ تھا۔ کچھ دیر کے بعد پانی نے اپنا عمل شروع کیا۔ اور جو اثر مُرجھائے ہوئے گلاب پر پڑا ہوا تھا۔ وہی بڑھیا اور بڈھوں پر بھی ہونے لگا۔ اُن کے چہروں پر جو پہلے جھُریوں کا مجموعہ تھے۔ اور کسی متحرک لاش کی صورت سے مشابہ تھے۔ یک بیک صحت کی سُرخی غازہ بندی کرنے لگی۔ اُن کے بال جن سے زیادہ سفید برف بھی نہ ہو گی۔ دفعۃً سیاہ ہو گئے۔ اُن کا جسم جس میں بجز پوست و استخوان کے اور کچھ باقی نہ تھا۔ اور جس میں رعشہ نے اضطراری حرکت کی ایک مستقل کیفیت پیدا کر دی تھی۔ طاقتور اور توانا ہو چلے اور مرجھائے ہوئے پٹھوں کی جگہ گدرائے ہوئے عضلات نے لے لی۔ اُنہوں نے مسرت افروز استعجاب سے ایک دوسرے کی صورت کو دیکھا۔ اور محسوس کیا۔ کہ

کہ ساحری کے کسی زبردست کرشمہ نے اُن سلوٹوں کو جو زمانہ کے ہاتھ نے اُن کی پیشانی پر ڈال دی تھیں صاف کر نا شروع کر دیا ہے۔ مسز وچرلی نے ٹوپی کو زیادہ بانکپن کے ساتھ رکھا۔ اس لئے کہ یہ احساس بجلی کی طرح اس کی ایڑی سے چوٹی تک دوڑ گیا۔ کہ کسی پُراسرار طاقت نے اُسے عجوزہ ہفتاد سالہ سے عروس چاردہ سالہ بنا دیا ہے چاروں کے چاروں فرط اشتیاق سے چلائے۔ کہ ڈاکٹر اس عجیب و غریب پانی کا ایک ایک گلاس ہمیں اور دو۔ ہم جوان تو ہو گئے۔ لیکن بڑھاپے کا کچھ کچھ اثر ابھی باقی ہے۔

ڈاکٹر ہیڈگر جو فلسفیانہ متانت کے ساتھ بیٹھا ہوا اس دلکش تجربہ کو دیکھ رہا تھا۔ اُن کی اس بنیابی پر دل ہی دل میں خوب ہنسا۔ اور چاروں گلاس بھر کر ان کے حوالے کئے۔ یہ گلاس ابھی پوری طرح سے حلق سے اُترنے بھی نہ پائے تھے۔ کہ پینے والوں کی ہیئت کذائی میں اور بھی نمایاں تغیر ہو گیا۔ اور بجائے ایک عجوزہ دیرینہ سال اور تین پیران فرتوت کے ڈاکٹر ہیڈگر کی میز کے گرد ایک حسین و جمیل عورت اور تین جوان رعنا بیٹھے ہوئے نظر آئے۔

چشمہ جوانی کے پانی کی عجیب و غریب خاصیتوں نے پینے والوں کی ماہیت ایک قلم بدل دی۔ اور اُن سے وہ وہ حرکتیں سرزد ہونے لگیں۔ جنہیں دیکھ کر بے اختیار اَلشَّبَابُ شُعْبَةٌ مِنَ الْجُنُوْنِ کی حکیمانہ حقیقت کی تصدیق ہوتی تھی۔ کرنیل کلیگرو صاحب نے اپنی جذبہ ریز نگاہیں مسز وچرلی کے اُس چہرے پر جس کی دلفریبی لحظہ بلحظہ بڑھتی جاتی جما دی۔ اور فرمانے لگے کہ جانِ من اس وقت تو تم پر غضب کا جوبن ہے۔ مہ جبین بیوہ چونکہ اپنے شصت سالہ تجربہ سے جانتی تھی۔ کہ کرنیل صاحب کی مدح میں مبالغہ کے عنصر کی آمیزش حد اعتدال سے زیادہ ہوا کرتی ہے۔ لہذا وہ بے تحاشا آئینہ کی طرف اس اندیشہ کو دل میں لئے ہوئے دوڑی۔ کہ مبادا ایک پوپلے منہ والی بڑھیا

کا جھریاں پڑا ہوا بھیانک چہرہ اُسے نظر آئے۔ مسٹر گسکان کا دماغ پولٹیکل خیالات
کی جولانگاہ بن گیا۔ کبھی تو وہ جوش میں آکر آوازِ بلند حبِّ وطن۔ قومی سلطنت
اور عامہ خلائق کے حقوق کے متعلق بڑے بڑے شاندار فقرے اپنی زبان سے ادا کرتے
تھے کبھی کوئی نہایت ہی خطرناک منصوبہ جس کا بلند آہنگ نغمہ اُنہیں حبس دوام
بعبور دریائے شور کا مستوجب قرار دیتا۔ ایسے نیچے سُروں میں الاپتے تھے۔
لہ خود اُن کے کان کو ان کی آواز کا شرمندہ احسان نہیں ہونا پڑتا تھا۔ مسٹر ڈبرن کی
نگاہِ خیال کے سامنے روپیوں اور اشرفیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ جن کو گنتے گنتے آپ
س تجویز پر بھی غور فرماتے جاتے تھے۔ کہ افریقہ میں برف کی تجارت کرنے کے لئے
پند وہیل مچھلیوں سے کام لینا چاہئے۔ جو قطب شمالی کے برفانی تودوں کو کھینچ کر خط
ستوا تک پہنچا دیں۔ اِدھر مسز وچرلی ابھی تک آئینہ کے سامنے کھڑی ہوئی اسپنے
روئے دل آرام اور اندامِ رعنا کا مشاہدہ فرما رہی تھیں۔ کہ جبین و عارض کے کسی کونے
بں کہیں کوئی دبی دبائی سکڑی سکرائی جھری رہ تو نہیں گئی۔ جب پوری طرح سے
پنا اطمینان کر چکیں۔ تو ایک ایسے اندازِ رفتار کے ساتھ جس پر کسی طائر سبک پرواز
ی جنبش کا گمان ہوتا تھا۔ آپ ڈاکٹر ہیڈگر کی کرسی کی طرف بڑھیں اور کہنے لگیں
بڈھے تجھ پر میں واری جاؤں اُٹھ اور میرے ساتھ ناچ۔ اس پر تینوں نوجوانوں
نے فرمائشی قہقہہ لگایا۔ اور بیچارے ڈاکٹر کی جھکی ہوئی کمر نحیف و ناتوان جسم اور پیرانہ سری
ا خوب ہی مضحکہ اُڑایا۔

ڈاکٹر ہیڈگر نے اُن کے اس تمسخر کو نظر انداز کر کے مسکین بن کر جواب دیا۔ کہ اس
اجز کو تو اس عزت سے معاف رکھا جائے۔ میرے ناچنے کا زمانہ مدت ہوئی گزر
چکا۔ البتہ ان تینوں نوجوانوں میں سے کوئی بھی ایسی شوخ و شنگ مہ پارہ کے ساتھ
وشی تمام ناچنے پر آمادہ ہوگا۔

یہ سُننا تھا کہ کرنیل کلیگرو نے بیوہ کو اُس کے عالم دوشیزگی کے نام سے پکار کر کہا کہ کلیرا آؤ میرے ساتھ ناچو۔ مسٹر گسکان چلّائے۔ کہ نہیں نہیں ان کا رفیق میں ہوں گا۔ مسٹر ڈبرن نے جوش میں آ کر کہا۔ کہ تم دونوں کو کلیرا کے ساتھ ناچنے کا کوئی حق نہیں۔ پچاس سال ہوئے کہ اُس نے میرے ساتھ ناچنے کا وعدہ کیا تھا۔ اور وہ وعدہ ابھی تک پورا نہیں ہوا۔

تینوں بیوہ کے گرد جمع ہو گئے۔ ایک نے اس کے دونوں نورانی ہاتھ تھام لئے۔ دوسرے کا ہاتھ اس کی نازک کمر کے گرد حمائل ہو گیا۔ تیسرے کی انگلیاں اُس کی مشکبار زلفوں سے اٹکھیلیاں کرنے لگیں۔ لجاتی ہوئی بدن کو چراتی ہوئی مسکراتی ہوئی ہانپتی ہوئی وہ تینوں کی حوصلہ آزما گرفت سے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتی رہی لیکن پھر بھی اس جذبہ آفرین قید سے رہا نہ ہوئی۔ ناز و نیاز اور حُسن و رقابت کی اس سے زیادہ دل فریب تصویر کم کسی کے دیکھنے میں آئی ہوگی۔ اگرچہ راوی کا بیان ہے۔ کہ شام کے دُھندلکے میں چشم بصیرت کو قدآدم آئینہ کے اندر یہ مضحکہ خیز تماشا نظر آتا تھا۔ کہ تین جھرٹوس بڈھے ایک پوپلی بڑھیا کے متاع پوست و استخوان کی خاطر آپس میں دست و گریباں ہو رہے ہیں۔

نوخیز بیوہ کی اُن اداؤں نے کہ وہ اپنے چمنستان حُسن کی گلچینی کے لئے صلائے عام بھی دیتی ہے۔ لیکن جب ہاتھ پھول کے نزدیک آتا ہے۔ تو جھٹ سرک کر الگ ہو جاتی ہے۔ تینوں رقیبوں کو از خود رفتہ کر دیا۔ اور وہ ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ ایک ہاتھ سے تو ہر ایک اپنی محبوبہ کو پکڑے رہا۔ اور دوسرے ہاتھ سے رقیب کا ٹینٹوا جا دبوچا۔ غرض تینوں میں خوب ہی دھینگا مشتی ہوئی۔ اور اس پکڑ دھکڑ میں آبنوس کی میز اُلٹ گئی۔ اور آبِ شباب کی بلورین صراحی فرش پر گر کر پاش پاش ہو گئی۔

اس طوفان بے تمیزی کو روکنے کے لئے ڈاکٹر ہیڈ گر نے کہا کہ اے صاحبو یہ کیا

رہا ہے! مسز وچرلی ہوش میں آئیے!! آپ لوگوں نے تو تہذیب و شائستگی کو گلدستۂ طاق نسیاں ہی بنا دیا۔

ڈاکٹر کی آواز میں جادو کا اثر تھا۔ چاروں اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ایک جانفرسا کیفیت اُن کے دماغ پر طاری ہوگئی۔ اُنہیں محسوس ہونے لگا۔ کہ وہ حرارت جواب تک اُن کے جسم میں موجود تھی سلب ہورہی ہے۔ اور ایک عجیب طرح کی سردی اُن کے مغز استخوان تک کو منجمد کرنے لگی ہے۔ اُنہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اور ہر ایک کو یہی نظر آیا۔ کہ وہ رعنائیاں اور دل آرائیاں جو اُن میں یک بیک جمع ہوگئی تھیں۔ ایک ایک کرکے اُن سے رخصت ہورہی ہیں۔ اور بڑھاپا اپنی تمام کمزوریوں اور بدنمائیوں کے ساتھ اُفتاں وخیزاں اُن کی طرف آرہا ہے۔

کیا یہ محض فریب نظر کا ایک کرشمہ تھا؟ کیا ایک عمر کے تغیرات اتنی تھوڑی سی جگہ میں جمع ہوگئے تھے؟ کیا وہ حقیقت میں جوان نہ تھے۔ بلکہ چار سال خوردہ نفوس تھے جو اپنے ہم سن ڈاکٹر ہیڈگر کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔

ان سب سوالات کا جواب چاروں نے اس حسرت بھرے استفسار میں دیا۔

"کیا ہم اتنی جلدی بڈھے ہوگئے؟"

ڈاکٹر ہیڈگر نے اُن پر حقارت آمیز رحم کی نگاہ ڈالی۔ اور کہا کہ ہاں آپ لوگ حقیقت میں بڈھے ہوگئے ہیں۔ آب جوانی قرابہ کے ٹوٹ جانے سے زمین پر بہ گیا۔ لیکن مجھے اس کا ذرا افسوس نہیں۔ آپ لوگوں نے مجھے ایسا دل نشیں سبق دیا ہے۔ کہ اگر آب بقا کا چشمہ میرے دروازہ پر اُبل رہا ہو۔ تو میں اپنے خشک ہونٹ اس سے تر نہ کروں۔ خواہ اس کا اثر بجائے چند لمحوں کے صدیوں تک ہی کیوں نہ قائم رہے۔

نازلی بیگم کا فیصلہ

پہلا ایکٹ

سین۔ لاہور میں ایک سجی ہوئی انگریزی وضع کی کوٹھی۔

وقت۔ شام کے سات بجے۔

نازلی بیگم (مسٹر عبدالواحد بیرسٹر کی ناز آفریں بیٹی جو اپنے بلند خیال باپ کی تہذیب پرستی کے تصدق میں انگلستان سے تعلیم کا پنج سالہ زمانہ ختم کر کے حال ہی میں وطن کو لوٹی ہے۔ لیمپ کی شعاعیں گلابی ساٹن کے فانوس میں سے چھن چھن کر دو چٹھیوں پر پڑ رہی ہیں۔ جو اس کے سامنے ایک تپائی پر رکھی ہیں اور وہ خود ایک پر تکلف کوچ پر بیٹھی ہوئی اپنے جی سے باتیں کر رہی ہے) :۔ ایک دن میں دو پیغام! کسے قبول کروں اور کسے رد کروں جس طرح اسلام نے مردوں کو چار چار بیبیاں کر لینے کی اجازت دی ہے کاش عورتوں کو اس سے آدھا ہی حق دیا ہوتا۔ تاکہ میں ایک وقت میں ان دونوں کے ساتھ عقد کر سکتی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ میری گرویدگی پر حق رکھتے ہیں۔ ایک دولتمند اور ذی وجاہت ہے۔ دوسرا علم و فضل اور حسن ظاہری میں اپنا جواب آپ ہے۔ محمد اسلم وائسرائے کی کونسل کا ممبر ہے۔ لکھ پتی زمیندار ہے۔ اور ملک میں ایک خاص وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ محمد یوسف اعلیٰ درجہ کا شاعر ہے۔ نہایت رنگین و مرصع نثر لکھتا ہے۔ اور اخبار "کوکب صبح" کے ایڈیٹر و مالک ہونے کے لحاظ سے معروف اشخاص کے حلقہ میں داخل ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے۔ کہ اُس کی آنکھوں میں کچھ ایسا جادو ہے۔ کہ جس دن پہلی مرتبہ ٹھنڈی سڑک پر میری اس کی نگاہیں چار ہوئی ہیں۔ تو مجھ پر نیم مدہوشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ کاش محمد یوسف کے پاس آنریبل محمد اسلم کی دولت ہوتی۔ تو پھر مجھے فیصلہ کرنے میں مطلق تامل نہ ہوتا۔ لیکن اس وقت

حیران ہوں کہ کیا کروں۔ اسلم کو خشک جواب دیتے وقت سونے اور چاندی کے پہاڑ قلم کے سامنے آکھڑے ہوتے ہیں۔ اور یوسف کے خیال کا دامن خواب میں نہیں چھوٹنے پاتا (آواز بلند خط پڑھنے لگتی ہے)

پیاری نازلی۔ مجھے تمہارے دل دادوں کے حلقہ میں داخل ہوئے اتنی مدت گزر چکی ہے کہ میرے دل کی کیفیت سے تمہیں ناواقف نہ ہونا چاہئے۔ قصہ مختصر یہ کہ میں تم پر دل سے فریفتہ ہوں۔ اور اگرچہ جانتا ہوں کہ میں تمہارے قابل نہیں لیکن پھر بھی یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا تم میری بی بی بننا پسند کرو گی۔ میں اس سوال کا جواب طلب کرنے کے لئے آج شام کے آٹھ بجے حاضر ہوں گا۔ خدا کرے یہ جواب باصواب ہو + تمہارا دلدادہ

محمد اسلم

اس خط کی شان ہی کہے دیتی ہے۔ کہ اس کا لکھنے والا لگی لپٹی نہیں جانتا۔ کھرا اور بے لاگ آدمی ہے۔ جس کی متانت تحریر عاشق کی کیفیت اضطرار کا مضحکہ اُڑاتی ہے۔ لیکن اُس کے پختہ کار اور صاحب دولت ہونے میں شک نہیں۔ اور مجھے اُس کے یہ دونوں وصف دل سے پسند ہیں۔ یوسف اگرچہ ذی ثروت نہیں۔ یا کم از کم اس وقت اُس کی مالی حالت اچھی نہیں۔ اس لئے کہ اُس کی کل کائنات اُس کا اخبار ہے جس کی اشاعت ایک ہزار سے زیادہ نہیں۔ اور خریداروں کو بد مذاقی سے کم امید ہے کہ یہ تعداد کچھ بہت زیادہ ترقی کرے گی۔ لیکن کیا دولت ایسی شے ہے۔ جس کی محبت کے سامنے کوئی حقیقت ہو! دل میں اگر کسی کے عشق کی شمع روشن ہو۔ تو جھونپڑی میں رہ کر بھی محلوں کا لطف آسکتا ہے۔ لیکن اگر حریم سینہ میں نور محبت کا اُجالا نہ ہو۔ تو نقرہ و زر۔ دیبقی و دیبا۔ طاق و رواق۔ خدم و حشم سب ہیچ ہیں۔ آہ یوسف! جب تیری دلربا صورت تیری متوالی آنکھیں تیرا جذبہ ریز تکلم بے ہے چشم و گوش کی از خود رفتگی کا سرمایہ بنتا ہے۔ تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ کہ دنیا میں بجز تیرے اور کسی شے کا

حقیقی وجود نہیں۔ اور تو اگر پہلو میں ہو۔ تو کوئی ایسی مصیبت نہیں جس پر مجھے راحت و عشرت کا گمان نہ ہو (دوسرا خط اُٹھا کر پڑھنے لگتی ہے)

میری جان میرے ایمان

کیا کہوں کتنی دفعہ جی چاہا ہے۔ اور بے اختیار چاہا ہے کہ ان مضامین کو سپرد قلم کروں۔ جن سے زیادہ دلربا اور دل آویز مضمون میرے دماغ کو آج تک نہیں سوجھا۔ لیکن اس تہیدستی و بے مائگی کا بُرا ہو۔ جس نے میرے پیمانہ تمنا میں تلخابۂ تامل ملا دیا ہے ورد جب حد سے گزرتا ہے تو دوا ہو جاتا ہے۔ میرا جام محبت بھی آخر چھلک کر رہا۔ سچے عشق کی محفل میں مسند صدارت کہیں بچھی ہوئی نظر نہیں آتی۔ یہاں شاہ و گدا سب پہلو بہ پہلو بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ میں اگرچہ فقیر ہوں۔ لیکن تمہاری محبت کے صدقے میں بادشاہوں سے اونچا دماغ رکھتا ہوں۔ اور اسی لئے اپنے پیک خیال کو اس قابل سمجھتا ہوں کہ تمہارے حجلۂ ناز تک بار پا سکے۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے ممکن نہیں کہ تمہارے آئینہ دل میں میری محبت کا آفتاب منعکس نہ ہو۔ اسی امکان کو پیش نظر رکھ کر میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ کیا میری غربت و تہیدستی کی پردہ پوش تمہاری اُلفت ہو سکتی ہے۔ اور تم میرے مقدر کی عنان اپنے ہاتھ لے سکتی ہو۔ اس یقین کو تمہارے دل تک کیسے پہنچاؤں۔ کہ اگر میں زندہ ہوں۔ تو محض اس لئے کہ تم پر اپنی روح کو اپنی ساری ہستی کو تا دم زیست نچھاور کر رہا ہوں۔

تمہارا کشتۂ الفت

یوسف

کیا اس خط کو پڑھ کر بھی جس کے لفظ لفظ سے درد ٹپک رہا ہے۔ اور حرف حرف سے ایثار آفرین محبت کی بو آ رہی ہے۔ روپیہ کی کوئی وقعت دل میں رہ سکتی ہے۔ روپیہ! لاحول ولا قوۃ!! اس لفظ کے نام سے مجھے گھن آنے لگی۔ یوسف!

دونوں جہان کی دولت تمہاری زلیخائی سے مجھے باز نہیں رکھ سکتی (اپنی ساعد میں کو جس پر ایک جواہر نگار گھڑی بندھی ہوئی ہے۔ بلند کر کے وقت دیکھتی ہے۔ ارے ساڑھے سات ہو گئے! (کمرے کے تابدان کی سجی ہوئی کارنس کی طرف بڑھ کر گھنٹی بجاتی ہے) محمد اسلم کے آنے کا وقت ہو گیا۔ اور عجب نہیں کہ یوسف بھی آتا ہو۔ (خطوں کو لفافہ میں ڈال کر جیب میں رکھ لیتی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے۔ اور خادمہ آتی ہے)۔

خادمہ سے مخاطب ہو کر:۔ دل افروز! اگر محمد یوسف آئیں۔ تو انہیں اس کمرہ میں لے آنا۔ اور کوئی اور صاحب آئیں تو کہدینا کہ آج شام بی بی کو کسی سے ملنے کی فرصت نہیں ہے۔

دل افروز:۔ بوی بہت اچھا۔ لیکن اگر آنریبل محمد اسلم آئیں تو؟

نازلی بیگم (گھڑک کر) دل افروز سٹرن تو نہیں ہو گئی ہو۔ کیا میں نے صاف لفظوں میں نہیں کہدیا کہ کسی دوسرے صاحب سے میں نہ مل سکوں گی۔

دل افروز۔ بہت خوب حضور۔

(دل افروز چلی جاتی ہے)

دوسرا ایکٹ

آٹھ سال بعد

سین۔ محلہ ملیاراں (دہلی) میں پانچ روپیہ مہینہ کرایہ کا ایک مختصر سا مکان مکان کے ایک حصہ میں اخبار "کوکب صبح" کا مطبع ہے۔ اور دوسرے حصہ کے ایک ہی حجرے سے اخبار کے دفتر باورچی خانے کھانا کھانے سونے بیٹھنے کا گوناگوں کام لیا گیا ہے۔ فرش اور فرنیچر نام کو نہیں۔ چھت دھوئیں کی کلونس سے سب دیکھو

بنی ہوئی ہے۔ ہر طرف افلاس اور نحوست کے آثار نمودار ہیں۔
نازلی بیگم (جواب مسٹر محمد یوسف ایڈیٹر "کوکب صبح" کی بیاہتا بی بی ہے۔ چار چھوٹے چھوٹے بچوں کو لئے جن میں سے ایک شیر خوار ہے۔ اور چلا چلا کر رو رہا ہے۔ ایک ٹوٹے کوچ پر بیٹھی ہے۔ اور ایک بے ٹونٹی کی چاء دانی سے تمام چینی کی پیالیوں میں جن پر سے روغن اُڑگیا ہے چاء انڈیل رہی ہے): ۔ حامد مکھن صرف جمعہ کے دن ملے گا ضد نہ کرو۔ اس وقت سوکھا توس ہی کھالو۔ رشید للچائی ہوئی نظروں سے اس انڈے کی طرف مت دیکھو۔ یہ تمہارے ابا جان کے لئے ہے۔ عائشہ ننھا ایسا پھوٹ پھوٹ کر کیوں رو رہا ہے؟
عائشہ:۔ اماں جان ننھے کی بوتل میں جو دودھ آپ نے ڈالا تھا۔ وہ میرے منع کرتے کرتے رشید پی گیا۔ اور بوتل کو پانی سے بھر کر کہنے لگا۔ کہ اتنا سا بچہ دودھ اور پانی کا فرق کیا جانے؟ ایلو! ابا جان آگئے (عائشہ بھاگی ہوئی باہر چلی جاتی ہے۔ مسٹر محمد یوسف کمرے میں داخل ہوتے ہیں "کوکب صبح" کی ایک کاپی جسے کسی کاتب سے لکھوا کر ابھی ابھی لائے ہیں ہاتھ میں ہے۔ ایڑی سے لے کر چوٹی تک فلاکت کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ چہرے پر ہجوم افکار اور کثرتِ آلام سے جو جھریاں پڑ گئی ہیں۔ انہیں دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ جامۂ ہستی کی آستینیں گاذرِ قدرت نے وقت سے پہلے چن دی ہیں۔ سرکنڈے کے ایک ڈگمگاتے ہوئے مونڈھے پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور ایک آہ سرد بھر کر کچھ دیر تک ماتھے کو ہتھیلی پر ٹیکے ہوئے فکر میں ڈوبے رہتے ہیں۔ پھر)
مسٹر محمد یوسف۔ (تلخی کے لہجہ میں نازلی بیگم سے مخاطب ہو کر):۔ نازلی کیا اچھا ہو اگر گھر کے انتظام میں ذرا زیادہ سلیقہ اور کفایت شعاری سے کام لو۔ جب سے گورنمنٹ نے ڈھائی ہزار کی ضمانت طلب کی ہے۔ جو تمہارا زیور بیچ کر میں نے داخل کی۔ حالت روز بروز نازک ہوتی چلی جا رہی ہے۔

نازلی بیگم (شوہر پر ملامت آمیز نظر ڈال کر):۔اس سے زیادہ کفایت کیا خاک کروں
روٹی کے ایک سوکھے ٹکڑے اور پانی کے ایک آبخورے تک نوبت آ پہنچی ہے
اور بمشکل روح وجسم کا اتحاد قائم ہے۔ میں تم سے نہ کہتی تھی کہ اس اخبار کو بند کر دو
اور کوئی اور دھندا پیٹ پالنے کا اختیار کرو۔ لیکن تم نے میری ایک نہ سنی اور
ایک نامہ نگار کے بے ربط رو قلم کا خمیازہ کھینچ کر اس حالت کو پہنچ گئے۔ گورنمنٹ کو
تمہاری اصلی نیت کے ساتھ کیا ہمدردی۔ یہاں تو ذرا لغزش ہوئی۔ اور ضمانت کے
شکنجے میں جکڑے گئے۔ خواہ اس میں کسی کا گھر بار ہی کیوں نہ بک جائے۔ میں جانتی ہوں
کہ تم اپنے بادشاہ کے پسینے کے ایک قطرے کی جگہ اپنے سارے جسم کا خون بہانے کے
لئے تیار ہو۔ اور بادشاہ سلامت کے میز پر اگر "کوکب صبح" کی ایک کاپی رکھدی جایا کرے
تو مجھے یقین ہے۔ کہ وہ اُس ایک قابل گرفت مضمون پر جس کی پاداش میں تم سے
ڈھائی ہزار کی ضمانت جبراً و قہراً لی گئی ہے۔ اغماض کا پردہ ڈال دیں۔ اور باقی مضامین
کے صلہ میں جن کے حرف حرف سے وفا اور ارادت کی بو آتی ہے۔ تمہیں سی۔ آئی۔ ای
بنا دیں لیکن اس قانون کا کیا علاج جس کو نہ جذبات کی پروا ہے نہ احساسات کا خیال
یہ تو ایک آگ ہے جس میں نیک و بد وفادار و سرکش جو پڑا جل گیا ؎

اگر صد سال گبر آتش فروزد
چو یک دم اندراں افتد بسوزد

اب تم ہی بتاؤ کہ میں خود تو فاقہ بھی کر گزروں۔ مگر ان چھوٹے چھوٹے بچوں کی
مصیبت کیوں کر دیکھوں (زار و قطار رونے لگتی ہے)

محمد یوسف۔ میں نے حماقت کی شادی کر لی۔ اس ملک میں اول تو ایڈیٹر کی مٹی
ہی خراب ہے۔ پریس ایکٹ نے اُس کی رہی سہی حیثیت بھی کھو دی۔ اور ادخال
ضمانت کے وقت جس کا خوف شامت اعمال کی طرح ہر وقت سر پر سوار ہے

ظرین کی بدمذاقی وسے دھری شاہ مدار کا حکم رکھتی ہے۔ جنہیں مرے کو مارنے کے
ںمیں ید طولیٰ حاصل ہے۔ آدمی اکیلا ہو تو ان سختیوں کو جھیل بھی جائے۔ لیکن بال
بچوں کو ان مصیبتوں میں اپنے ساتھ شریک ہوتے دیکھنا ایک صدمہ جانفرسا ہے
دروازہ کے پٹ بڑے زور سے کھلتے ہیں۔ اور عائشہ ہانپتی کانپتی بے تحاشا اندر
خل ہوتی ہے)

عائشہ:۔ امی جان۔ خدا بخش قصاب باہر کھڑا ہے اور کہتا ہے کہ میرا تین مہینے
حساب چکتا کردو۔ ورنہ میں آج سے گوشت اُدھار نہ دونگا۔ نہال چند بزاز کا آدمی بھی
پنے حساب کی فرد لئے مطبع میں موجود ہے۔ اور عبداللہ پریس مین باتوں باتوں میں کہہ
تھا۔ کہ اگر آٹھ دن کے اندر اندر ہمارا روپیہ نہ ادا کیا گیا۔ تو مطبع قرق کرا لوں گا۔

نازلی بیگم۔ خدا کرے نہال چند کی دھمکی سچی ہو۔ تاکہ جو کام میری طلائی چوڑیوں
سفارش پر گورنمنٹ کے ہاتھوں انجام پاتے پاتے رُک گیا تھا۔ وہ میرے ایک
پھول دار ریشمی گون کی ضد کی وجہ سے جو میری شادی کی یادگار ہے۔ نہال چند
دکھائے۔

محمد یوسف۔ نازلی اس قدر افسردہ مت ہو۔ یہ مصیبت کے دن کچھ ہمیشہ تھوڑے
رہیں گے۔ آخر راحت کا زمانہ بھی کبھی آئے ہی گا ؎

دور گردون گر دو روزے برمراد ما نگشت | دائماً یکساں نباشد کار دوراں غم مخور
ہر غمی را شادئی در پے بود دل شاد دار | ہیچ دردے نیست کو را نیست درماں غم مخور

"کوکب صبح" تو چلتا چلاتا نظر نہیں آتا۔ اپنا خرچ ہی نکالے جائے تو غنیمت ہے
اصول یا بے اصولیاں جو اخبار کو آج کل کامیاب بناتی ہیں مجھے پسند نہیں۔ نہ میں
سلمان جہلا کو خوش کرنے کے لئے ہندوؤں کو گالیاں نکالنے کا روادار ہوں۔ نہ ہندوؤں
ے حلقہ میں اپنے اخبار کو ہردلعزیز بنانے کے لئے اُن کی قابلِ اعتراض باتوں کو لائق

تحسین ظاہر کرنے کا حامی ہوں۔ نہ گورنمنٹ کی جھوٹی خوشامد کرکے اپنے شیشۂ ضمیر کو اربابِ ذوق سلیم کے سنگِ استہزا کا مقابل بنانا چاہتا ہوں۔ پھر آج کل کے طوفانِ بے تمیزی میں میرے اخبار کی اشاعت بڑھے تو کیونکر بڑھے۔ اس کو میں بند بھی نہیں کرنا چاہتا۔ اس لئے کہ اس کا بند کر دینا گویا حق و راستی کے منہ میں جان بوجھ کر کپڑا ٹھونس دینا ہوگا۔ اس لئے میں اپنی آمدنی کے بڑھانے کی کوئی اَور ہی فکر کرتا ہوں دو کتابیں لکھی رکھی ہیں۔ ایک ناول ہے اور دوسرے ایک علمی کتاب کا ترجمہ ہے۔ یہ چھپ جائیں تو عجب نہیں کہ ہزار پانسو روپیہ مل جائے۔

نازلی بیگم۔ تم ہمیشہ سے خیالی پلاؤ پکانے کے عادی تھے۔ کتابیں بیچ کر اگر نفع حاصل کرنا چاہو گے۔ تو رہا سہا اثاث البیت بھی نیلام ہو جائے گا۔ تم کس خیال میں ہو۔ مولوی شبلی ور خواجہ حالی جیسے مصنفوں تک کی کتابیں تو بکتی ہی نہیں۔ تمہاری کتابوں کو کون پوچھے گا۔ یہ میں نے مانا۔ کہ تم اچھے لکھنے والے ہو۔ لیکن یہ زمانہ اہل قلم کے لئے سازگار نہیں ہے۔ علمی کتابوں کا تو نام مت لو۔ کہنے کو سب کہتے ہیں۔ کہ علمی کتابوں کے تراجم سے اُردو لٹریچر میں اضافہ ہونا چاہئے۔ اور بڑے بڑے شاندار فقروں میں اُن لوگوں کو ملامت کی جاتی ہے۔ جو دماغ رکھتے ہیں۔ لیکن اس سے کام نہیں لیتے۔ لیکن جب کوئی کتاب جو حقیقت میں قابل قدر ہو چھپتی ہے۔ تو چھاپنے والا اُس کی چھپائی کا خرچ بھی نہیں نکال سکتا۔ باقی رہے ناول سو آج کل اُن کا بازار بھی سرد پڑا ہے۔ میں آج تک یہی نہیں سمجھی۔ کہ پبلک پسند کس چیز کو کرتی ہے اور اُس کا مذاق کیا ہے۔

محمد یوسف۔ تو پھر کیا کروں۔ ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھا ہوں۔

نازلی بیگم۔ بھانڈ بنو۔ نقلیں کرو۔ بندر نچاؤ۔ سرکار رس اور دربار نشیں لوگوں کی ہاں میں ہاں ملاؤ۔ جھوٹ بولو۔ خوشامد کرو۔ اس قسم کی ہر بات کرو لیکن خدا کے لئے مضمون نگاری

یا تصنیف و تالیف کو ذریعہ معاش بنانیکے خبط سے باز آجاؤ۔

محمد یوسف اُٹھ کر چلا جاتا ہے۔ اور کچھ دیر کے بعد نازلی بیگم ایک ٹوٹے ہوئے آئینہ کے سامنے اپنے عکس سے یوں خطاب کرتی ہے:۔ کیا تو اُسی حور وش لڑکی کی تصویر ہے جس کا یہ خیال تھا کہ عشق و محبت کی دولت وہ دولت ہے جس کے مقابلہ میں ساری دنیا کے خزانے ہیچ ہیں؟ کیا رعنائی شباب کبھی تیرے حصے میں آئی تھی؟ یہ اُترا ہوا چہرہ۔ یہ زرد رخسار۔ یہ فکرمند آنکھیں۔ یہ نحیف و لاغر جسم جس میں بجز پوست و استخوان کے کچھ باقی نہیں کس کلکا ہے؟ (کانپ کر مُنہ پھیر لیتی ہے۔ اور ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔) کیا اب بھی اگر مجھے موقع ملے۔ تو میں یوسف ہی کو پسند کروں؟ کیا اُس زندگی سے اُس کی ان الجھنوں کو جانتے ہوئے میں مقابلہ کروں؟ ہرگز نہیں! ہزار بار نہیں!! اسلم مجھے اب دیکھے۔ تو کیا وہ مجھے پہچان لے؟ کیا اُس کی شادی ہو چکی ہے؟ کاش میں پھر لاہور میں ہوں۔ جوانی کا عالم ہو۔ اور مجھے اسلم و یوسف دونوں میں انتخاب کرنے کا موقع دیا جائے۔ اس زندگی سے تو میں بیزار ہوں (اپنی ساڑھی کا پلّو ہاتھ میں تھام لیتی ہے)۔ او میلی کچیلی ململ کی ساڑھی مجھے تجھ سے نفرت ہے (پلّو کو پھاڑ ڈالتی ہے) اور اگرچہ میں جانتی ہوں۔ کہ دوسری ساڑھی جو دھوبن کے ہاں گئی ہوئی ہے ابھی نہیں آئی۔ اور کل صبح میرے پاس پہننے کو کچھ بھی نہیں۔ پھر بھی میں تجھے نوچوں گی۔ پھاڑوں گی۔ پھاڑ دوں گی (پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے)

تیسرا ایکٹ

سین۔ جو پہلے ایکٹ میں تھا۔ یعنی لاہور میں ایک سجی ہوئی انگریزی وضع کی کوٹھی۔ پہلے اور دوسرے ایکٹ کا درمیانی وقفہ پندرہ منٹ ہے۔ نازلی بیگم آنکھیں

لیتی ہوئی کوچ سے اُٹھ بیٹھتی ہے۔ اور چاروں طرف گھبرائی ہوئی نظر ڈالتی ہے۔
اُس کے چہرے کی مایوسی تعجب سے۔ تعجب بے اعتباری سے اور بے اعتباری
اطمینان سے بدل جاتی ہے۔

نازلی بیگم:۔ خدا کا شکر ہے۔ کہ یہ محض ایک خواب پریشاں تھا (یوسف کے خط کے
پُرزے پُرزے چاروں طرف بکھرے ہوئے پاتی ہے) مجھے یاد نہیں پڑتا۔ کہ میں
نے اسے چاک کیا ہو۔ البتہ ململ کی ساڑھی کو جو میں خواب میں پہنے ہوئے تھی۔ میں
نے ضرور پھاڑا تھا۔ ململ کی ساڑھی! (نفرت کے لہجہ میں) میں نے کبھی نہیں پہنی۔
اور نہ کبھی پہنوں گی۔ شکر ہے کہ ابھی تک نکاح کی زنجیر میرے پاؤں میں نہیں پڑی۔
اور اس سے بھی بڑھ کر شکر کا مقام یہ ہے۔ کہ وہ چار ڈراؤنے بچے میرے نہیں ہیں۔
اگرچہ عائشہ کی شکل ضرور پیاری تھی۔ پریس ایکٹ اور اُردو اخباروں کی حالت زار
کے مباحث پڑھنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔ پھر بھی اگر یوسف کے ساتھ شادی کرنے سے
میرا یہی حشر ہونے والا ہے۔ تو میں نے فیصلہ کر لیا (گھنٹی بجاتی ہے)

دل افروز۔ کیا حضور نے گھنٹی بجائی تھی؟

نازلی بیگم۔ ہاں۔ یہ چائے کی کشتی اُٹھا کر لے جاؤ۔ اور سنو۔ آنریبل مسٹر محمد اسلم آئیں۔
تو اُنہیں یہاں لے آنا۔ اور کوئی صاحب آئیں۔ تو کہہ دو کہ مجھے فرصت نہیں۔

دل افروز۔ لیکن بیوی مجھے خیال پڑتا ہے۔ کہ آپ نے مجھ سے یہ فرمایا تھا۔ کہ
"مسٹر محمد یوسف"

نازلی بیگم۔ نہیں دل افروز میں اُن سے نہیں ملوں گی۔ سمجھی؟

دل افروز:۔ جی ہاں حضور خوب سمجھی۔

(دل افروز چلی جاتی ہے)

(دس دن بعد مسٹر محمد یوسف اپنے دفتر میں کوکب صبح کی اگلی اشاعت کے

لئے لیڈر لکھنے بیٹھے ہیں۔ جس کا موضوع یہ ہے۔ کہ اعلیٰحضرت جارج خامس خلد اللہ ملکہٗ
کی رونق افروزی ہند کی یادگار میں۔ بہ تقریب جشن مبارک تاج پوشی قانون مطابع منسوخ
ہوجانا چاہیئے۔ لاکھ قلم کو دوات میں ڈبوتے ہیں۔ رہ رہ کر سر کھجاتے ہیں۔ مگر نہ آ
کام دیتی ہے نہ آورد۔ دماغ طرح طرح کے پریشان کن خیالات کی جولان گاہ بنا ہوا
ہے۔ مجبور ہوکر قلم ہاتھ سے رکھدیتے ہیں۔ اور اپنے جی سے باتیں کرنے لگتے
ہیں۔

مسٹر محمد یوسف۔ میں احمق تھا۔ جو اس بے استطاعتی پر اپنے آپ کو نازلی بیگم
کے قابل سمجھا۔ آج کل دنیا پر روپیہ کی حکومت ہے۔ نہ کوئی علم وفضل کو پوچھتا ہے
نہ کمال ولیاقت کو۔ محمد اسلم میرے بوٹ کا تسمہ باندھنے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ آنریبل
ہونے پر اس کی لیاقت کی یہ کیفیت ہے۔ کہ پرائمری تعلیم کو باعتبار خیالات کا پیش خیمہ
سمجھ کر ملک کے لئے مضر قرار دینے کی مضحکہ انگیز لغویت کا اقدام کرتا ہے۔
مگر چونکہ روپیہ والا ہے۔ اس لئے نازلی بیگم جھٹ اس کے آغوش میں چلی جاتی ہے
میں ایسی بی بی سے باز آیا۔ مجھے میکالے اور ٹینی سن اور اسپنسر پڑھی ہوئی حریت پسند
بی بی کی ضرورت نہیں۔ جو اس اعلیٰ تعلیم پانے پر بھی اس درجہ کینہ زر اور غرض پرست
ہو۔ مجھے تو وہی پردہ نشین اردو پڑھی ہوئی قرآن کی آیتوں کا مطلب سمجھی ہوئی بی بی
چاہیئے۔ جو میری شریک رنج وراحت ہو سکے۔ اور میرے وال دلئے کو بلا دقت سمجھنے
کی قابلیت رکھتی ہو۔

پردہ کا جنازہ

۱۹۳۵ء

بیسویں صدی کے تمدن کی رفتار بھی دخان اور برق سے کچھ کم تیز نہیں۔ سو سال پہلے

جو انقلاب پچاس برس میں ہیولیٰ سے صورت بنتا تھا۔ وہ موجودہ قرن میں دیکھتے دیکھتے ظاہر ہو جاتا ہے۔ اہل مغرب کہا کرتے تھے۔ کہ مشرق غیر تغیر پذیر ہے۔ اور اب تک بھی بہت سے مدبرین ایسے ہوں گے۔ جن کا یہ خیال ہوگا۔ کہ مشرق کی جو حالت آدم وحوّا کے وقت میں تھی وہی آج تک قائم ہے۔ لیکن یہ لوگ ہندوستان میں آئیں۔ اور دیکھیں۔ کہ ان کا دعوے کس حد تک درست ہے۔ بمبئی۔ کلکتہ اور برٹش انڈیا کے دوسرے بڑے بڑے شہروں میں تو مغربی تہذیب کی شمع سالہا سال سے روشن ہے۔ اور ان کی نسبت آج سے پچاس سال پہلے بھی یہ گمان کرنا داخل مبالغہ نہ سمجھا جاتا۔ کہ تمدن جدید کے دیوتے تمدن ویورپ کے چند محلے اپنے کندھے پر اُٹھا کر ہندوستان کے مختلف گوشوں میں بسائے ہیں۔ لیکن اُن مقامات میں جہاں کے رہنے والوں کا خون اور گوشت اور پوست تین ہزار سال کے ہندی اور ایک ہزار سال کے اسلامی اثرات سے مرکب ہو جن کے رگ وپے میں پُرانی رسمیں اور قدیم دستور سرایت کرکے بمنزلہ فطرت ثانی ہو چکے ہوں۔ مغربی تمدن اور مغربی معاشرت کا دیکھتے دیکھتے اپنے جھنڈے گاڑ دینا ایک ایسا کرشمہ ہے۔ جس کے آگے اعجاز عیسوی اور افسون سامری کی کوئی حقیقت نہیں۔

ہندوستان میں مغربی تمدن کی اشاعت کا مطلب صرف یہی نہ سمجھنا چاہئیے۔ کہ یہاں برقی روشنی جگمگاتے ہوئے بنگلے یا ریلیں یا موٹر کاریں یا ہوائی جہاز یا بے تار کا سلسلہ پیغام رسانی یا تعیش وتنعم کے وہ ہزارہا سامان نظر آتے ہیں۔ جو اہل یورپ کی جدتِ طبع اور حدتِ ذہن کا نتیجہ ہیں۔ یہ تو محض دو دلفریب ودلربا کھلونے ہیں۔ جو دایہ مغرب نے اپنے مشرقی بچوں کے دل بہلانے کے لئے مہیا کئے ہیں۔ یورپ کی تہذیب کا اصلی وحقیقی اثر جس کے لحاظ سے وہ اپنے آپ کو کامیاب کہہ کر مبارکباد دے سکتی ہے۔ وہ اثر ہے۔ جس کی برقی رو اہل ہند کے دماغوں اور دلوں میں دوڑ

گئی ہے جس نے ہندوستان کے قدیم تمدن کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکا ہے۔ اُن کے دیوان خانوں سے گزر کر اُن کے زنان خانوں تک جا پہنچا ہے۔ جو اُن کے مردوں۔ عورتوں بوڑھوں۔ بچوں کو کٹھ پتلی کی طرح تار پر نچا رہا ہے۔ یہ اثر دولت آصفیہ کے دارالحکومت حیدرآباد دکن میں سب مقامات سے زیادہ نظر آتا ہے۔ اور جب یہ خیال آتا ہے کہ یہ دولت ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کی یادگار ہونے کے لحاظ سے قدیم اسلامی تمدن کا مرکز ہے۔ تو جو حالت اس میں آج کل نظر آرہی ہے۔ اُسے دیکھ کر چشم عبرت کُھلی کی کُھلی رہ جاتی ہے۔

میری عمر اس وقت ساٹھ سال ہونے کو آئی ہے۔ جو زمانہ میرے شباب کا تھا۔ وہ آج کل کی روشنی میں دورِ جاہلیت وظلمت سمجھا جاتا ہے ۱۹۰۵ء میں حیدرآباد کی حالت کچھ اور تھی ۱۹۳۵ء میں کچھ اور ہی نظر آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں پہلے چند جھونپڑے تھے۔ وہاں اب دلکشا ایوان اور عالی شان قصر آسمان سے ہم کلام ہیں۔ ہر مکان بجلی کی روشنی سے بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ ہر جگہ غیر معمولی تمول کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ شہر اور اُس کے بلاد کا نقشہ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ نواب ثریا جاہ بہادر کے گرانبہا عطیہ کی بدولت حسین ساگر کا بند جو تناپور واڑی سے لے کر صرف دلیرالملک کے مقبرہ تک بندھا ہوا تھا۔ اب ایوان بیگم پیٹھ کے نیچے ہوتا ہوا ریل کی سڑک کے پہلو بہ پہلو تالاب کے چاروں طرف محیط ہے۔ اور بند کی سڑک کے دونوں جانب اس خوبصورتی سے چمن بندی کی گئی ہے۔ کہ جب اور کوئی تشبیہ نہیں ملتی۔ تو جنت الفردوس کا خیالی استعارہ ذہن کے سامنے آجاتا ہے۔ میر جملہ کا تالاب بہ صرف کثیر از سرِ نو تیار کرا دیا گیا ہے۔ اور اس میں اب بارہ مہینے پانی بھرا رہتا ہے۔ اور اس کے کنارہ کنارہ جو سڑک حسین شاہ ولی کی درگاہ تک گئی ہے۔ وہ باغ کی ایک مسلسل روش نظر آتی ہے۔ گولکنڈہ اور حیدرآباد کے درمیانی علاقہ میں باغوں اور چمنوں کا ایک جنگل

آتا ہے جس کے بیچوں بیچ ایک نہر ہو کر گزرتی ہے۔ جوان دونوں مقامات کو
یتی ہے۔ مسرز گریڈی اینڈ کمپنی نے حیدر آباد اور سکندر آباد کی برقی روشنی کا
لے رکھا ہے۔ جس کی بدولت ان دونوں مقامات میں آفتاب کے غروب
تے ہی دن نکل آتا ہے۔ لیکن سب سے بڑا انقلاب جس نے حیدر آباد کا نقشہ بالکل
بدل دیا ہے۔ اور جسے دیکھ دیکھ کر مجھے یہ خیال آتا ہے۔ کہ اس دار فانی میں مجھ جیسے
سے کھوسٹ پرانی لکیر کے فقیر کو زیادہ دنوں زندہ رہنے کا اب کیا حق حاصل ہے۔
نسواں کا انقلاب ہے۔ بجز اُس عہد قدیم کی دیرینہ سال اور غیر مہذب عورتوں
جو میری ساتھنیں ہیں۔ اور جنہیں پاس وضع اب تک گھر سے نکلنے اور نامحرموں
دوچار ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ بہت کم تعلیم یافتہ پردہ نشینوں کا نام
میں آتا ہے۔ باغوں۔ کلبوں۔ جلسوں اور سڑکوں پر عورتیں بھی مردوں کی
کھلے بندوں پھرتی نظر آتی ہیں۔ اور مردوں کی کوئی ایسی مجلس نہیں ہوتی جس
زرق برق کی ساڑھیاں۔ بنارسی دوپٹے۔ سلمے ستارے کی جاکٹیں نگاہ کو خیرہ
دل کو بے قابو نہ کرتی ہوں۔ مردوں اور عورتوں کے بے تکلفانہ میل جول اور
ئی نسواں کے حق کے اس بے حجابانہ ادعا کے صدقہ میں ایک نئی نسل ایسی پیدا
لی ہے۔ جس کی پرورش اور نگہداشت کے لیے سرکار کی طرف سے متعدد
لقیط قائم کئے گئے ہیں۔ جب ہم جوان تھے۔ تو مولوی محب حسین صاحب نامی ایک
حیدر آباد میں رہتے تھے۔ جن کے سر پر یہ خبط سوار تھا۔ کہ عورتوں کو بھی
وں کے برابر آزادی ملنی چاہیئے۔ اور جس طرح مردوں کے اخلاقی افعال سے تاوقتیکہ
سائٹی کی آزادی کو ان سے کوئی نقصان نہ پہنچے کسی کو تعرض کرنے کا کوئی حق نہیں
طرح عورتوں کو بھی اپنی حرکات و افعال کا ذمہ دار سمجھنا چاہیئے۔ اب تو ان بزرگ
ہڈیاں بھی چونہ ہو چکی ہوں گی۔ اگر روح کو بقا ہے۔ اور یہ خیال بعض اگر جسم سے

علیحدہ ہونے کے بعد وہ اُن مقامات کے گرد وپیش منڈلایا کرتی ہے۔ جہاں کبھی وہ بقید جسم رہتی تھی۔ تو اُن کی روح یہ دیکھ کر خوش ہوگی۔ کہ آخر ملک کی بہو بیٹیاں پردہ توڑ کر اور آزادی کی اسٹیج پر جلوہ گر ہو کر رہیں۔

+ + + + + +

+ + + + + +
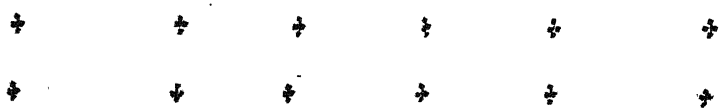
شام کے چار بجے ہوں گے۔ ہلکا سا ابر محیط آسمان ہے۔ ہوا کے جھونکے اُن درختوں کے پتّوں کو جنبش دے رہے ہیں۔ جو گولکنڈہ اور حیدرآباد والی نہر کے دونوں طرف نصب ہیں۔ ایک درخت کے نیچے ایک نوجوان جس کی عمر بیس اور پچیس سال کے درمیان ہوگی۔ بیٹھا ہوا کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوتا۔ کیونکہ "رسالہ مخزن" جس کی ورق گردانی یہ نوجوان کرنا چاہتا ہے رہ رہ کر اُس کے ہاتھ سے گرا پڑتا ہے۔

اگرچہ یہ شخص بالکل نوعمر ہے۔ لیکن اس کے چہرہ پر وہ شکنیں پڑی ہوئی ہیں۔ جو یا تو دیرینہ سالی کے افکار اور یا دفعۃً کسی ناقابل برداشت صدمہ کے اٹھانے سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ وضع قطع سے وہ نئی روشنی کا ایک ہونہار نمونہ معلوم ہوتا ہے۔ بیڈم پاپل کے ہاں کا سلا ہوا ایک نہایت عمدہ تراش خراش کا انگریزی سوٹ توزیب بدن ہے ہی لیکن انگریزی ٹوپی بھی پہنے ہوئے ہے۔ حالانکہ اگر انگریزی ٹوپی کے پہننے سے جس میں زیبائش نام کو نہیں مقصود یہ ہو۔ کہ اُس کا چھجہ آنکھوں کو سورج کی کرنوں کو بچائے رکھے۔ تو اس وقت اس کی کچھ ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ اول تو درخت کا سایہ سر پر تھا۔ اور دوسرے ابر بھی گھرا ہوا تھا۔ اس کے آباؤ اجداد جنھوں نے ساری عمر نیمہ و جامہ پہنے ہوئے گزار دی اگر اپنے نونہال کو اس وضع میں آکر دیکھیں تو اپنے تعجب اور غصہ کا صلہ ان الفاظ میں پائیں۔

با من میا ویز اے پدر فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

ہمارے فیشن ایبل نوجوان کا دل اس وقت طرح طرح کے افکار وآلام کی جولان گاہ بنا ہوا ہے۔ ابھی بچہ ہی تھا۔ کہ ماں باپ کا سایہ سر پر سے اُٹھ گیا۔ لیکن چونکہ باپ ایک خاندانی نواب تھا جس نے ایک بہت بڑی جائداد چھوڑی تھی۔ اس لئے معاش کی طرف سے فارغ البال تھا۔ تعلیم وتربیت چچا نے کی۔ اور ایک انگریز اتالیق مقرر کرکے اعلےٰ درجہ کی تعلیم کا انتظام کیا۔ نظام کالج سے بی۔ اے کی ڈگری پانے کے بعد اس نے اپنی جائداد کا انتظام خود اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس وقت اس کی عمر ۸ ا سال تھی۔ نئے تمدن کی برکتوں کے صدقہ میں شہر کی حسین سے حسین شریف لڑکیوں سے جلسوں اور محفلوں میں اُسے ملنے کا اتفاق ہوا۔ لیکن کسی سے اُس کی قسمت نہ لڑی۔ ایک دن اُسے تھیٹر جانے کا اتفاق ہوا۔ حیدرآباد میں چند سال سے ایک ناٹک کی کمپنی نے مستقل طور سے اقامت اختیار کی تھی۔ اور حال میں ایک نئی ایکٹرس کلکتہ سے بلائی گئی تھی۔ جس کے حسن گلوسوز اور نغمہ دلفریب نے حیدرآباد والوں کو لٹو بنا رکھا تھا۔ یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ ہمارے نوجوان کی نظر اس غارت گر ہوش وعقل پر پڑی۔ دیکھتے ہی تیر عشق کلیجے کے پار ہو گیا۔ اُس رات کلیجہ تھام کر وہ گھر واپس آیا۔ اور رات جوں توں کرکے کاٹی۔ دوسرے دن نامہ وپیام شروع ہوا اور چونکہ روپیہ پیسہ کی کمی نہ تھی۔ لہذا ایکٹرس نکاح کرنے پر راضی ہو گئی۔ اور شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔ ہمارے نوجوان کا ایک دوست تھا۔ جو بچپن سے اُس کے ہر راز کا شریک اور ہمدم تھا۔ اس دوست سے اُس نے اپنی محبوبہ کو جدید تہذیب کے قاعدے کے موافق انٹروڈیوس کیا۔ ایکٹرس کا حسن ایسا نہ تھا کہ دوست دیکھتا اور از خود رفتہ نہ ہو جاتا ؎

بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا

ادھر ایکٹرس بھی اسے زیادہ طرحدار اور زیادہ مالدار پاکر ریجھ گئی۔ اور چند دن کے بعد ہمارے نوجوان کو اس مضمون کا خط لکھا:۔

"افسوس ہے کہ میں آپ سے نکاح نہیں کر سکتی۔ میرا دل ایک اور شخص پر آگیا ہے۔ اور ایسی حالت میں جبکہ دوسرے سے محبت کرتی ہوں۔ آپ سے شادی کرنا خلافِ اصول ہوگا۔ آپ کی دل شکنی تو ضرور ہوگی۔ لیکن مجبوری ہے"

اس خط کو پڑھ کر ہمارے نوجوان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ایک شمع تھی۔ جو اُس کے آگے سے ہٹالی گئی۔ اور وہ ایک تاریک زندان میں رہ گیا۔ اس وقت اُس کے دل کو اگر کوئی ٹٹولتا۔ تو بجز ناامیدی کے اُس میں اور کچھ نہ پاتا۔ اُس نے قصد کر لیا۔ کہ اب کبھی کسی عورت سے شادی نہ کروں گا۔

یہی خیالات تھے جن کا اس وقت اُس کے دل میں ہجوم تھا۔ دفعتہً اُسے ایسا محسوس ہوا۔ کہ کوئی شخص کشتی چپوؤں سے کھیتا ہوا پاس سے گزر رہا ہے۔ اُس نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔ تو نہر کے بیچوں بیچ ایک کشتی کو پایا۔ جس میں ایک مہ جبین لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ نافرمانی رنگ کی ایک ریشمی ساڑھی جس پر سلمہ ستارے کا حاشیہ ٹکا ہوا تھا۔ اُس کے لمبے قد کی موزونیت کو دوبالا کر رہی تھی۔ زربفت کی ایک چست جیکٹ میں سے اُس کے جسم کے بالائی حصہ کا تناسب پھٹا پڑتا تھا۔ اور ساڑھی کا پلو سر پر دوپٹہ کا کام دینے کے بجائے گلوبند کا کام دے رہا تھا۔ پلو کے سرک جانے سے سر بالکل عریاں رہ گیا تھا۔ اس عریانی میں سنبل کے دلفریب مرغولوں نے ایک عجیب شان دلربائی پیدا کر دی تھی۔ گلے میں ایک جڑاؤ چندن ہار پڑا ہوا تھا۔ اور کانوں میں الماس کے بُندے اور مرصع طلائی بالیاں تھیں۔ جو

اس بات کا ثبوت دے رہی تھیں۔ کہ باوجود مغربی تہذیب کی دلدادہ ہونے کے یہ حور وش ابھی تک مشرقی اداؤں کی حلقہ بگوش ہے۔ شاید نوجوانوں کا دل اُن کی آنکھوں میں ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ اس نئی تصویر کے دیکھتے ہی ایکٹرس کا تصور ہمارے نوجوان کے دل سے محو ہو گیا۔

لڑکی نے مستانہ نگاہ سے اُس کی طرف دیکھا اور کشتی کھینتی ہوئی نکل گئی۔ اس نگاہ نے نوجوان کا کام ہی تمام کر دیا ؎

جگر اور دل کا جتنا حوصلہ تھا قتل گیا سارا　　نگہ کے تیر کا ہونا ترازو اس کو کہتے ہیں

وہ اپنے دل میں سوچنے لگا۔ کہ کیا میرا سویا ہوا نصیب پھر جاگ سکتا ہے۔ اور یہ پری پیکر نازنین مجھے مل سکتی ہے۔ لڑکی کی نرگس مخمور کے کرشمہ میں اُسے یہ خیال خود ایک خفیف سے تبسم کی جھلک بھی نظر آئی تھی۔ لیکن اس خیال کو اُس نے اپنے دل سے یہ کہہ کر دُور کر دیا۔ کہ عورتیں اپنے تبسم کی نعمت مجھ جیسے بدبخت پر ضائع نہیں کرتیں۔ یہ سوچ کر اُس نے مخزن پھر اُٹھایا۔ اور پڑھنے لگا۔ مگر کچھ دیر کی ورق گردانی کے بعد اُس نے رسالہ کو پھر گھاس پر رکھ دیا۔ اور دل میں یہ سوچنے لگا۔ کہ کشتی میں چائے کا سامان رکھا ہوا تھا۔ ہو نہ ہو یہ مہ پارہ اپنے عاشق کے پاس وعدہ پورا کرنے گئی ہے: دونوں مل کر چائے پئیں گے۔ اور میں یہاں بیٹھا ہوا خون جگر پیا کروں گا۔ ہائے ری قسمت اگرچہ یہ خیال بھی کشتی والی لڑکی سے ایک دفعہ پھر ملنے کی تمنا کو اُس کے دل سے دُور نہ کر سکا۔ اُس نے جی میں ٹھان لی۔ کہ جو ہو سو ہو۔ میں اس کا انتظار کروں گا۔ اور ایک دفعہ تو ضرور اس کی پیاری صورت دیکھ کر رہوں گا۔ لیکن پھر اُسے خیال آیا۔ کہ ممکن ہے۔ کہ کشتی واپس نہ آئے۔ سیدھی تو لکنڈہ چلی جائے۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے جیب سے پنسل نکالی۔ اور ایک خط لکھا۔ جس کا القاب یہ تھا "کشتی والی نازنین کے نام"

کشتی جس میں یہ [illegible] سوار تھی۔ کچھ دُور جا کر کنارہ پر لگ گئی۔ مہ جمال کشتیبان نے اُتر کر [illegible] ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا۔ اور چائے کا سامان اُتار کر ایک درخت کے نیچے ہری ہری گھاس پر لے جا رکھا۔ تھوڑی دیر میں اسپرٹ لیمپ کے اوپر الومینیم کی کیتلی میں پانی اُبلنے لگا۔ اور اُن نازک ہاتھوں نے ایک نقرئی چاردان میں چائے دم کر کے ایک پیالی لبالب بھری۔ ہمارے دلزدہ نوجوان کو اگر معلوم ہوتا کہ اُس کا دل چھین کر لے جانے والی اکیلی بیٹھی ہوئی چائے پی رہی ہے۔ اور کوئی حریف اس لطف میں اُس کا شریک نہیں۔ تو اُس کا کلیجہ بلیوں اُچھلنے لگتا۔ چائے پینے کے بعد نازنین نے اپنی ہینڈ بیگ سے ایک رسالہ نکالا۔ اور گھاس پر لیٹ کر پڑھنے لگی۔ یہ رسالہ "خاتون" تھا۔

آفتاب کی آخری کرن نے مغربی افق کے آنچل میں منہ چھپایا تھا۔ کہ یہ نازنین نہر کے کنارے کے فرشِ زمردیں سے اُٹھی۔ اور کشتی پہ سوار ہو کر گھر کی طرف واپس چلی۔ شائد یہ پُرانا مقولہ درست ہے ؎

عشق اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود

ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ اس وقت اُس کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا۔ کہ وہ وجیہ و شکیل نوجوان جو نہر کے کنارہ بیٹھا ہوا تھا۔ اب بھی اُسی جگہ ہو گا۔ یا اُٹھ کر کہیں چلا گیا ہو گا۔ جب وہ اس درخت کے مقابل پہنچی۔ تو اُس کی متجسس نگاہوں کو نوجوان تو نظر نہ آیا۔ مگر جہاں وہ بیٹھا ہوا تھا وہاں ایک چھڑی ایک سگرٹوں کا ڈبہ، ایک رسالہ اور چند خط لکھنے کے کاغذ پڑے ہوئے تھے۔

اول یہ دیکھ کر کہ ان چیزوں کا مالک کہیں پاس تو نہیں۔ نازنین کشتی کو کنارہ پر لائی اور ایک میخ زمین پر گاڑ کر کشتی کو اُس سے باندھ دیا۔ پھر وہ ان چیزوں کی طرف بڑھی جو اپنے مالک کی غفلت و بے پروائی کا ثبوت دے رہی تھیں۔ نازنین یہ سمجھ کر کشتی سے

ر ہی تھی۔ کہ ان چیزوں کو سنبھال کر ایک جگہ درخت کی جڑ میں رکھ دے گی کہ کوئی
لزر انہیں اُٹھا نہ لے جائے۔ اس خیال سے اُس نے رسالہ اٹھایا اور خط لکھنے کے
راق اس کے اندر رکھنے شروع کئے ہی تھے۔ کہ دفعتہً اُس کی نگاہ ایک تحریر پر پڑی جس
عنوان "کشتی والی نازنین کے نام" تھا۔

ہیں یہ کیا؟ (ہنس کر) کیا اس ناچیز کی طرف اشارہ ہے؟ حضرت کو یہاں تک جرأت
ئی۔ کہ میرے نام خط لکھا۔ مگر شکل و صورت سے تو ثقہ معلوم ہوتے ہیں۔ دیکھوں لکھا
ہے"

ظاہر ہے کہ اس خط پر کسی کا نام نہ تھا۔ بلکہ "کشتی والی نازنین" لکھا تھا۔ اور چونکہ اکثر شوقین
ج خاتونیں اس نہر پر کشتی میں آتی جاتی تھیں۔ اس لئے کہا جا سکتا تھا۔ کہ کسی دوسری
نین کی طرف اشارہ ہو۔ لیکن اُس عقل نسوانی نے جو پیچیدہ سے پیچیدہ دلی عقدوں
ا چشم زدن میں حل کر تی ہے۔ اُسے یقین دلایا۔ کہ اس خط کی مکتوب الیہا وہی ہے۔ اسی
ل سے اُس نے خط پڑھنا شروع کیا۔

"کشتی والی نازنین کے نام"۔

"آپ ادھر سے ابھی ہو کر گزریں۔ اور مجھے ایسا خیال سا ہوا۔ کہ آپ جاتے وقت
، دیکھ کر مسکرائیں"

زنین۔ "چہ خوش! آپ کی خود پسندی دیکھئے۔ میں ایسوں کو دیکھ کر مسکرائی تھی!!"

"لیکن نہیں۔ آپ نہ مسکرائی ہوں گی۔ شاید یہ میرا وہم ہی وہم ہے"

ازنین۔ "ایں یہ تو بیچارے گاؤدی ہی معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے کشتی کو قصداً اسی
رہ پر چلایا۔ اور اہتماماً چپوؤں کو پانی پر زور زور سے مار کر حضرت کو اپنی طرف متوجہ کیا
جب میری طرف دیکھنے لگے۔ تو میں مسکرائی۔ لیکن پھر بھی آپ اسی تبسم کو اپنا وہم
سمجھتے ہیں"

"مگر میں ایک دل شکستہ شخص ہوں جس کا دنیا میں کوئی مونس وہمدم نہیں ہے۔
اسی وجہ سے بعض وقت میرا خیال کہیں سے کہیں چلا جاتا ہے۔ اور جب سے . . . . .
. . . . . دو سال ہوئے"

نازنین: "اخاہ میں سمجھی۔ حضرت نقد دل ہار چکے ہیں"

"کہ میرا جہاز بے لنگر و بادبان بحر حوادث میں تھپیڑے کھاتا پھرتا ہے۔ اس دنیا میں نہ میرا کوئی رفیق ہے نہ دوست اور نہ محبوب۔ یہ باتیں اس لایق نہ تھیں۔ کہ سپرد قلم کی جائیں۔ لیکن آپ اجنبی محض ہیں۔ اور مجھے امید نہیں۔ کہ آپ میری اس کمزوری کی تضحیک و تحقیر کریں گی۔ میں مریض ہوں۔ اور میرا علاج محبت ہے۔ ایک دفعہ یہ تریاق مجھے ملا۔ لیکن میری بدنصیبی کہ فوراً ہی میرے ہاتھ سے چھن گیا۔ اور میں ہمیشہ کے لئے مایوس العلاج ہوگیا۔ اب کوئی نہیں۔ جو مجھ سے محبت کرے۔ اور میری محبت کی قدر کرے۔ تاہم میں اس گزرے ہوئے زمانے اس دلفریب خواب اُس مختصر تعشق کے تصور سے اُکتاتا نہیں ہوں۔ اور یہی سبق دُہرا دُہرا کر دن پورے کرتا ہوں۔ آپ کو ادھر سے گزرتے دیکھ کر پرانے زخم آلے ہوگئے"

نازنین: "حضرت بہکئے نہیں۔ جنہوں نے آپ کو زخمی کیا۔ وہ کوئی اور ہوں گی۔ مجھے تو آج آپ نے پہلی ہی دفعہ دیکھا ہے"

"اس لئے یہ عریضہ آپ کو لکھا ہے۔ مہربانی فرما کر میری کمزوری کو معاف کیجئے۔ میں اپنا راز اب تک اپنے سینہ میں رکھے رہا۔ اس کی آگ مجھے جلائے ڈالتی تھی۔ اس لئے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے آپ کو اپنا ہم راز بناتا ہوں۔ ممکن ہے کہ آپ بھی میری طرح شکستہ دل ہوں۔ اور آپ کو بھی کسی کی ہمدردی کی ضرورت ہو۔ لیکن سب سے زیادہ جو بات مجھے آپ کی طرف کھینچتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ آپ کی شکل و شباہت ہو بہو"

نازنین: "کہئے کہئے۔ ہوبہو میرے جیسی بلکہ صاف صاف یہی کیوں نہ کہئے کہ میں ہی تھی۔"

"کل جب آپ اس طرف سے گزریں گی تو اگر جوش جنوں کی یہی کیفیت رہی۔ تو عجب نہیں کہ میں کشتی ہی میں حاضر ہوجاؤں۔ اگر میں کشتی میں آؤں۔ تو میں آپ سے یہ سننے کا متمنی ہوں گا۔ کہ وقت پڑ آئے اور میں اس کا جواب یہ دوں گا۔ کہ میں نے ساری عمر آپ کے انتظار میں گزاری ہے۔ اس کے بعد۔"

اس خط کا سلسلہ مضمون یہاں تک پہنچ کر یکایک منقطع ہوگیا۔ پنسل گھاس پر پاس ہی پڑی تھی۔ اور معلوم ہوتا تھا۔ کہ راقم لکھتے لکھتے دفعتہً اٹھ کر کہیں چلا گیا ہے نازنین نے چاروں طرف اِدھر اُدھر اس خیال سے نظر ڈالنی شروع کی۔ کہ وہ کہیں پاس ہی چھپا کھڑا ہوگا۔ تھوڑی دیر تک انتظار کرنے کے بعد جب کوئی نہ آیا۔ تو کشتی میں سوار ہو کر گھر چلی گئی۔ سمت مقابل سے اُس کی چھوٹی بہن کشتی پر آ رہی تھی۔ جس نے دیکھتے ہی اپنی بڑی بہن سے پوچھا۔ آپ نے آج نہر والے حادثہ کا ذکر سُنا؟"

نازنین جو رستہ بھر نا تمام خط کا خیال کرتی آتی تھی۔ اس خیال سے کہ کہیں راقم خط نہر میں نہ ڈوب گیا ہو۔ ہکا بکا رہ گئی اور کہنے لگی: "خدا کے لئے جلد بتاؤ کیا حادثہ؟"

چھوٹی بہن: "ایک چھوٹا لڑکا ڈوبتے ڈوبتے بچ گیا۔"

نازنین۔ (اطمینان کے لہجہ میں) "بس یہی ہوا؟"

چھوٹی بہن۔ (منغض ہوکر) "تو اور کیا ہوتا۔ کیا ڈوب ہی جاتا؟"

نازنین: "معاف کرنا میں کچھ اور سوچ رہی تھی۔ ہاں تو کیا ہوا؟"

چھوٹی بہن: "ایک لڑکا نہر کے کنارے جا رہا تھا کہ پانی میں گر گیا۔ اور غوطے

کھانے لگا۔ قریب تھا کہ ڈوب جائے۔ کہ اتنے میں ایک شخص نے جو نہر کے کنارے بیٹھا ہوا مطالعہ کر رہا تھا۔ نہر میں کود کر اُسے بچا لیا۔ لڑکا بے ہوش تھا۔ اس لئے وہ شخص اُسے اُٹھا کر شہر کی طرف لے گیا"

نازنین :- کوئی نہایت ہی رحم دل شخص تھا (دل میں) خط کے ناتمام رہ جانے کی وجہ معلوم ہوگئی۔ کشتی اس عاجزہ کو کل یہاں ضرور لائے گی . . . . "

دوسرے دن نوجوان نہر کے کنارے ٹھیک اُسی مقام پر بیٹھا ہوا پڑھ رہا تھا۔ لیکن آج ہاتھ میں تحریر نہ تھا بلکہ حساب داغ تھا۔ دفعتہً کشتی کے کنارے لگنے کی آواز آئی۔ نوجوان نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔ تو نازنین کو پایا۔ مگر آج جوڑا بدلے ہوئے تھی۔ اور حسن کا عالم کچھ اور تھا کشتی دیکھتے ہی نوجوان بے قراری کے عالم میں اس کی طرف بڑھا۔

نازنین (ہنس کر) "وقت پر آگئے"

نوجوان :- "میں نے ساری عمر آپ کے انتظار میں گزاری ہے"

\+ \+ * \+ \+ * \+

تیسرے روز مشیر دکن کے لوکل کالم میں اہل حیدرآباد نے یہ خبر نہایت مسرت سے پڑھی۔

"کل شام مکہ مسجد میں ایک نہایت فیشن ایبل رسم شادی ادا ہوئی۔ دولہا ہمارے شہر کے ہر دلعزیز نوجوان رئیس نواب صلابت جنگ بہادر اور دلہن مس نازک بدن امیر الملک تھیں۔ چار بجے سے امراؤ عمائدین شہر کی آمد شروع ہوئی۔ ٹھیک ساڑھے چار بجے مدار المہام بہادر اور صاحب عالی شان بہادر دولہا کو لئے ہوئے آئے۔ جو محراب مسجد کے قریب کی کرسیوں پر جلوہ افروز ہوئے۔ پونے پانچ بجے نواب امیر الملک اور لیڈی امیر الملک دلہن کو لئے ہوئے آئیں۔ نواب صلابت جنگ

بہادر کا لباس خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ قدیم وضع کی دستار اور ایک فراک کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے اپنے خاندانی البم میں سے اپنے دادا یعنی صلابت جنگ اولی کی تصویر بیدم پاپل کو دکھاکر تصویر کے لباس کے نمونہ کی دستار اور کوٹ اپنی عروسی کے لئے خاص طور پر تیار کرایا تھا۔ اس دستار کو اُس زمانہ میں منصب داری اور کوٹ کو شیروانی کہتے تھے۔ عروس جو ماشاءاللہ باعتبار حسن وجمال اپنی نظیر آپ ہیں۔ اس موقع پر نہایت ہی دلفریب معلوم ہوتی تھیں۔ اور ایک نہایت پُرتکلف شادی کا ریشمی بوٹے دار گون جو پیرس کے جدید ترین فیشن کے مطابق تیار کرایا گیا تھا۔ پہنے ہوئے تھیں۔ گلے میں برقی موتیوں کا ایک نہایت بیش قیمت ہار تھا۔ اور ایک نہایت نفیس یورپین نقاب سر پر پڑا ہوا تھا۔

"عروس کے آتے ہی قاضی صاحب سبز کے قریب والی میز کے پاس گئے۔ اور نوشہ وعروس کی موالفت کا اعلان کرکے حاضرین کے سامنے اس معمولی فقرہ کا اعادہ کیا۔ کہ اگر کسی کو اس نکاح کی نسبت کوئی اعتراض ہو پیش کرے۔ اس کے بعد نواب صلابت جنگ بہادر کے چچا یعنی ہمارے شہر کے واجب الاحترام مفتی صاحب نے نوشہ کو اور نواب امیرالملک بہادر نے عروس کو قاضی صاحب کے سامنے پیش کیا۔ جنہوں نے ایجاب وقبول کے رسمی فقروں کا اعادہ کراکر رجسٹر نکاح پر دونوں کے دستخط کرائے۔ اس کے بعد صاحب عالیشان بہادر نے دُولہا دُلہن سے ہاتھ ملایا۔ اور مدارالمہام بہادر نے دُلہن کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ دروازۂ مسجد پر موٹر کاریں تیار تھیں۔ پہلی گاڑی پر دُولہا دُلہن سوار ہوئے۔ دونوں طرف کے عزیزوں نے دُولہا دُلہن پر ہار پھول چاول اور کفش برسائے "نواب صلابت جنگ "ماہ عسل" کے لئے اپنی دل ربا عروس کو لے کر مسجد

نئے انگریزوں میں شادی کے بعد دو لہا دُلہن کچھ عرصہ کسی دلفریب مقام میں گزارتے ہیں۔ اس زمانے کو ہنی مون کہتے ہیں۔ نئی روشنی کے دلدادہ جوان اور کسی رئیس انگریزوں میں سے اگر اپنے اس مزاج کرنے والے ہیں۔ وہاں ضرور ہے کہ ہنی مون بھی ہیں جس کا مشرقی نام "ماہ عسل" ہوگا۔

سے سیدھے اسٹیشن پر پہنچے۔ اور اسپیشل ٹرین میں سوار ہوکر وقارآباد تشریف لے گئے۔

"ہم نواب اور لیڈی صلابت جنگ کو تہ دل سے مبارکباد عرض کرتے ہیں۔ اور امید کرتے ہیں۔ کہ سال آئندہ ہمیں ان کو حیدرآباد کی سوسائٹی میں ایک امیرزادہ کے اضافہ پر دوبارہ مبارکباد دینے کی عزت حاصل ہوگی۔"

انگریزی زندگی کی ایک دلربا جھلک

"اس سے زیادہ ایک پائی نہ دوں گا۔"

یہ الفاظ میرے والد نے نہایت برافروختہ ہوکر کہے۔ اور اگرچہ طبیعت میری بھی بے قابو ہوچلی تھی۔ اور جی چاہتا تھا۔ کہ ترکی بہ ترکی جواب دوں۔ لیکن اس ڈر سے کہ مبادا لینے کے دینے پڑجائیں۔ میں نے زبان کو روکا۔ اور طرح دے کر مؤدبانہ لہجہ میں یوں جواب دیا:۔

"اباجان ازبرائے خدا آپ ہی انصاف فرمائیے۔ کہ کیونکر میں کسی ایسی عورت سے شادی کرسکتا ہوں۔ جس سے مجھ کو یا جس کو مجھ سے محبت نہ ہو۔ اور جس کا میں نے اس وقت تک منہ بھی نہ دیکھا ہو۔ ساتھ ہی آپ نے مجھے عاق کردینے کی دھمکی دی ہے اور یہ فرمایا ہے کہ آپ مجھے بالکل محروم الارث کردیں گے۔ ایسی حالت میں کیونکر ممکن ہے کہ میں کسی سربرآوردہ خاندان کی لڑکی سے ربط ضبط بڑھاکر اُسے اپنے حبالۂ عقد میں لاسکوں۔ آپ کو بخوبی معلوم ہے۔ کہ اس قسم کی راہ و رسم کے بڑھانے کے یہ معنی ہیں۔ کہ طرفِ ثانی کو چاکلیٹ اور پھولوں کے گلدستے خرید کردیئے جائیں۔ تھیٹروں میں لے جاکر تماشا دکھایا جائے۔ اور اسی طرح کے اور زرتار ڈورے ڈالے جائیں۔

... والا ڈیم نثر جیرلڈ کی عمر پینسٹھ سال تھی۔ مزاج نہایت چڑچڑا اور
... ہوا تھا۔ نخوت اور رعونت دماغ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اختلاف
... نہ لا سکتے تھے۔ یہ تمام زہر مجھ غریب پر اس طرح اگلا گیا۔

"بگوست۔ میں تمہاری بیہودہ باتیں نہیں سننا چاہتا۔ خبردار جواب زبان سے ایک حرف نکالا۔ تم اپنی عمر اور میرا روپیہ تباہ کرنے کے پیچھے پڑے ہو۔ تین دفعہ میری چیک بک تمہاری حماقتوں کا خمیازہ کھینچ چکی ہے۔ اب مجھے تم پر اعتبار نہیں رہا۔ تم بڑے ناخلف ہو۔ میں قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں۔ خدا جانے کب لڑھک جاؤں اگر نثر جیرلڈ کے نام کی وقعت تمہارے دل میں نہیں تو میرے دل میں تو ہے۔ میں نہیں چاہتا۔ کہ یہ نام مٹ جائے۔ اگر میں نے اول تمہارے کورے دماغ اور پھر خالی معدہ کی راہ سے تم میں عقل نہ ٹھونسی تو سہی۔ اور اگر یہ بھی نہ ہوا۔ تو پھر کوئی اور ترکیب کروں گا۔ ایک سو پاؤنڈ کی رقم تمہیں دے دی گئی ہے۔ ولیم کو ساتھ لے کر یہاں سے چل دو۔ اور اس وقت تک واپس آنے کا نام مت لو۔ جب تک کہ اس گھر میں کسی ایسی عورت کو لانے پر آمادہ نہ ہو جاؤ جو میری بہو بننے کے قابل ہو۔"

اس نادر شاہی حکم کا کیا جواب ہو سکتا تھا۔ میں خوب جانتا تھا۔ کہ مزید بحث اگر خطرناک نہیں تو فضول تو ضرور ہے۔ اس لئے جب میرا خدمتگار ولیم ساتھ لے جانے کا سامان درست کر چکا۔ تو ہم دونوں سہ پہر کی گاڑی میں سوار ہو کر سیدھے لنڈن کو روانہ ہو گئے۔ جرمن اسٹریٹ میں ہم نے ایک مکان کرایہ پر لیا۔ اور چونکہ جیب میں ایک سو پونڈ موجود تھے۔ اس لئے عیش امروز میں محو اور فکر فردا سے غافل ہو کر اسی ٹھاٹھ سے رہنے لگا۔ جس کا بچپن سے خوگر تھا۔ چار ہفتے بھی پورے نہ گزرنے پائے تھے۔ کہ سب روپیہ خرچ ہو گیا۔ اور میں اپنے خدمتگار سمیت لنڈن جیسے شہر غدار میں بیک بینی و دوگوش رہ گیا۔ آخر جب نوبت فاقہ کشی کے قریب پہنچی۔ تو میں نے

اپنے ایک دوست آنریبل ہیوبرٹ ڈٹورین سے دس پونڈ قرض لئے۔ لیکن دس پاؤنڈ کی لندن کے اخراجات سے مقابلہ میں کیا حقیقت تھی۔ میں نے ولیم سے کہا۔ کہ وفاداری بڑی اچھی چیز ہے بشرطیکہ پیٹ بھرا ہو۔ تم کیوں ناحق میرے ساتھ فاقے کھینچتے ہو۔ بہتر ہوگا۔ کہ آنریبل ہیوبرٹ ڈٹورین کے پاس جاکر نوکر ہوجاؤ۔ ان کو اپنی موٹرکار کے لئے ایک شوفر (موٹرران) کی ضرورت ہے۔ میں سفارشی رقعہ لکھ دوں گا جھٹ پٹ تمہیں نوکر رکھ لیں گے۔ تنخواہ بھی معقول ہے۔ ہفتہ میں تین پاؤنڈ لیں گے۔ اس میں تم تم ساجھی ہیں۔ جب پیٹ میں چوہے ناچنے لگیں گے۔ اور کوئی اور صورت نظر نہ آئیگی تو تم سے روپیہ قرض منگوا لوں گا۔ ولیم نے بھی میری رائے پر صاد کیا اور شنبہ کے روز رخصت ہوگیا۔

میرے پاس کلہم پانچ شلنگ تین پنس باقی تھے۔ لیکن ناعاقبت اندیشی دیکھو۔ تو ایسی ہو کہ اس ہیچ میرز پونجی کے سہارے گھر سے نکل کر میں نے سسیدھی ریجنٹ رسٹران جیسے شاندار ہوٹل کی راہ لی۔ جہاں کی گراں فروشی کی تاب صرف امراہی کے بٹوے لاسکتے ہیں۔ رسٹران کے وسیع ایوان میں داخل ہوکر میں ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور فہرست طعام میں سے جو میز پر رکھی تھی۔ صرف اس قدر چیزوں کے لانے کا خانساماں کو حکم دیا۔ جن کی قیمت میں ادا کرسکوں۔ برابر والی میز پر ایک نوخیز لیڈی جس کا اٹھارہ انیس سال کا سن ہوگا بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اگرچہ میں نے اپنی نشست کا انتخاب رسٹران میں داخل ہوتے وقت محض اتفاقیہ طور پر کیا تھا۔ لیکن اب جو سوچتا ہوں تو مجھے یقین ہوجاتا ہے۔ کہ کوئی نادیدہ و ناسنجیدہ قوت مجھے بے اختیار اس کرسی کے قریب کشاں کشاں لے آئی تھی۔ جس پر میری حسین ہم نشین جلوہ گستر تھی۔ میں نے اس کی نسبت حسین کا لفظ استعمال کیا ہے۔ لیکن کم از کم اس موقع پر تو یہ لفظ اپنے معنی کا شرمندہ نہیں ہے۔ وہ دل ربا تھی۔ سراپا ناز

تھی۔ اُس نے ایک نگاہ غلط انداز مجھ پر ڈالی۔ اور میں نے جانا۔ کہ اب میں کہیں کا نہیں رہا۔

پہلے تو میں اپنی بیزی پر بے اعتنائی کا مصنوعی حصار اپنے دل کے گرد کھینچے ہوئے نفس کو یقین دلاتا رہا۔ کہ میرا اس نازنین سے کوئی سروکار نہیں۔ مجھ سے وہ اجنبی۔ اُس سے میں ناآشنا۔ پھر میں اُس کا خیال دل میں لاؤں تو کیوں۔ لیکن نفس منہا اور کہنے لگا۔ کہ اب بے داہی ہوا ہے۔ ہمارا داؤں ہمیں سے چلتا ہے ؎

خواہی کہ عیب ہائے تو روشن شود ترا

یک دم منافقانہ نشیں در کمینِ خویش

کیوں نہیں صاف صاف مان جاتا۔ کہ اس حسینہ وجمیلہ کی نگاہ کا تیر تیرے دل میں ترازو ہو گیا ہے۔ نفس نے جب اس سختی کے ساتھ احتساب کیا۔ تو مجھے ماننا پڑا۔ کہ حقیقت میں میرے پانچوں حواس میرے جسم کا رواں رواں حسن و جمال کی اس پتلی کے لئے لرز رہا ہے۔

وہ میز پر کہنیوں کو ٹیکے بیٹھی تھی۔ اور اُس کے نورانی ہاتھ اُس کے دل ربا چہرے کے لئے تکیہ کا کام دے رہے تھے۔ اُس کی ٹوپی کے چھجے تلے مشکبار اور عنبر بیز بال جو سیاہی میں آدھی رات کو شرماتے تھے۔ برقی روشنی میں عجب آب و تاب کے ساتھ چمک رہے تھے۔ خمدار ابروؤں اور جگر گزار پلکوں میں سے دودھ بھری آنکھیں جن کی احضریت مشرقی آسمان کی لاجوردی کیفیت سے کہیں زیادہ دل آویز تھی۔ بے تابانہ رقص کرتی ہوئی چاروں طرف بجلیاں گرا رہی تھیں۔ چہرہ کتابی تھا جس کی گلابی رنگت گویا شفق کی موج میں غوطہ لگا کر نکلی تھی۔ ناک ستواں تھی۔ ہونٹ رسیلے تھے۔ اور کُنجِ لب پر ایک بے قرارانہ کیفیت جس میں غنچہ نورستہ کے تبسم کی جھلک نظر آتی تھی۔ اپنا جلوہ دکھا رہی تھی۔ غرض یہ نازنین شانِ خدا تھی۔ جس

میں کنکھیوں سے مبہوت و بیخود بنا ہوا دیکھ رہا تھا۔

اس وقت مجھے خیال آیا۔ کہ اگر اتفاقیہ طور پر اس حورش سے میری صاحب سلامت ہوجائے۔ اور مجھے بہ تقاضائے اخلاق اس کے لئے "لاویو" (ایک قسم کی شراب) کی ایک بوتل کی فرمائش رسٹران کے خانساماں سے کرنی پڑے تو میرا کیا حال ہو۔ یہ خیال آتے ہی میرے اندام خودداری پر لرزہ طاری ہوگیا۔ اس لئے کہ جو ناشتہ میں نے منگوایا تھا۔ اس کا بل ادا کرنے کے بعد میرے پاس صرف تین پنس باقی رہ جاتے تھے جن کا ہونا نہ ہونا شراب کی ایک بوتل کی قیمت کے مقابلہ میں مساوی تھا۔ اس وقت میں نے حسرت بھری نگاہوں سے اپنی جیب کی طرف نظر ڈالی۔ اور زیر لب یہ شعر گنگنایا ؎

چاہئے زرانِ بتانِ سیم تن کے واسطے
ہم قلندریاں نہیں کوڑی کفن کے واسطے

میری نظر اس ذلت کے احساس کے باعث جو بے زری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ خود بخود زمین میں گڑ گئی لیکن کچھ دیر کے بعد جب میں نے آنکھ اوپر اٹھائی۔ اور بے اختیار اپنی حور تمثال ہمنشیں کی طرف دیکھا۔ تو اُس کی سحر آفریں نگاہوں کو اپنے اوپر جما ہوا پایا۔ میں نے ہزار چاہا۔ کہ اپنی آنکھوں کو اس جاں گسل مقابلہ سے ہٹا لوں۔ لیکن نہ ہٹا سکا۔ وہ مجھے دیکھتے دیکھتے مسکرائی اور میری حسرت اور تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب وہ اپنے قہوہ کا پیالہ ختم کرکے اپنی کرسی اُٹھی۔ تو میرے مقابل والی کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔

فرط استعجاب نے میرے مُنہ پر مہر خاموشی لگا دی۔ آخر کار اُس مُہر کو کسی آواز نے اگر توڑا تو وہ "اوہ" کی بے معنی یا با معنی صدا تھی۔ اُس نے مُسکراتے ہوئے اور میری آنکھوں میں بدستور اپنی آنکھیں ڈالتے ہوئے سلسلہ سخن اس طرح شروع کیا "میں نہایت خوش ہوں کہ" اتنا کہہ کر وہ رک گئی۔ اور میری لکنت زدہ زبان نے نہ معلوم کس طور پر اُسے لقمہ دینے کی جانفزا ضرورت کو پورا کیا۔ لیکن چونکہ جو کچھ پیش آیا بالکل خلاف توقع تھا۔ اور دوسرے

لوگوں کی نظریں ہم پر پڑنے لگی تھیں۔ اس لئے میری فطری قوت انتقال ذہنی اس وقت
دفعتہً کام آگئی۔ اور میں نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ کہ آپ میرے ساتھ ہاتھ ملائیے۔ لوگ سمجھ
لیں گے کہ ہم ایک دوسرے کے شناسا ہیں۔ اس کے بعد اگر مجھے کسی بات کا ہوش ہے
تو وہ یہ ہے۔ کہ اس کا نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہاتھ میری جذبہ آزما گرفت سے رہا ہونے
کی کوشش کر رہا تھا۔ اور اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل رہے تھے۔

"میں خوش ہوں کہ مجھے اس وقت آپ سے سابقہ پڑا۔ آپ کی صورت کہے دیتی
تھی۔ کہ آپ اس قابل ہیں کہ آپ کے ساتھ تعارف پیدا کیا جائے۔ اور اس کے علاوہ ان
میں پیش دستی کرنے پر میں ضرورتاً مجبور تھی۔ آپ اُمید تو نہ کرتے ہوں گے۔ کہ میں باوجود
سابقہ جان پہچان نہ ہونے کے میں اس طرح آکر آپ سے ملوں گی؟"

میں "ہاں امید تو نہ تھی"

وہ "آپ خود جان گئے ہوں گے کہ میں بدرجہ مجبوری آپ سے ملی۔ میں اس وقت
پریشانی کی حالت میں ہوں اور بالکل بے سروسامان ہوں یعنی گھر سے بھاگ آئی ہوں"

میں (مبہوت و سراسیمہ ہوکر) "آپ گھر سے بھاگ آئی ہیں؟"

وہ "خدا میرے مقدر کو شرمائے۔ جس نے مجھ سے گھر چھڑایا۔ میں نے گھر ہی کو نہیں
بلکہ اپنے باپ کو بھی اور اپنے شوہر کو بھی۔ گھر چھوڑ کر چلے آنے میں ہے تو بڑا لطف لیکن
اس کے نتائج خطرناک معلوم ہوتے ہیں"

میں "وہ کیسے؟"

وہ "سب کچھ آپ سے بے کم و کاست کہہ تو دوں لیکن کہتے ہوئے ڈرتی ہوں۔ وہ
ضرور خفیہ پولیس سے اور وکیلوں سے میرا کھوج لگوائیں گے"

میں (تعجب بے اعتباری اور اس جاں گزا شبہ سے پریشان ہوکر کہ شاید یہ نازآفریں
کسی نہ کسی سنگین جرم کی مرتکب ہو) "جس شخص نے قانون کے دائرہ سے باہر قدم رکھا

ں کا کھوج کہیں نہیں لگایا کرتے۔"
وہ "خدا کا شکر ہے۔ لیکن کیا میری صورت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں خفیہ
میں سے تعلق رکھتی ہوں۔"
میں (اس بظاہر غیر مربوط استفسار سے متحیر ہو کر لیکن جی میں یہ ٹھان کر کہ جو دل آویز
دفعۃً اس سوال کے جواب نے دیا ہے۔ اُسے ہاتھ سے نہ جانے دوں گا) "کیا آپ
ننا چاہتی ہیں کہ آپ کیا نظر آتی ہیں؟"
وہ (مسکرا کر) "فرمائیے۔"
میں میز پر آگے کو جھکا۔ اور جو جواب میری زبان پر تھا۔ اس کے ادا کرنے کے لئے تمہید
طور پر ایک گہری سانس لی لیکن وہ سمجھ گئی کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ اس کی نگاہیں
یک بیک نیچی ہو گئیں۔ اور فوراً ہی اس نے کہا "جی نہیں معاف کیجئے! نہ کہئے! یہ کہہ کر
ں نے پھر آنکھیں اُوپر اٹھائیں اور کہا "میرے پاس دام موجود نہیں۔ آپ کو میرے
ے کا بل ادا کرنا ہوگا۔ کچھ مضائقہ تو نہیں۔"
زمین میرے پاؤں تلے سے یک بیک نکل گئی۔ اگر میرے بدن کو اس وقت کاٹا
ا۔ تو لہو کی ایک بوند نہ نکلتی۔ جو مصیبت کا پہاڑ مجھ پر دفعۃً اس طرح ٹوٹ پڑا۔ اس نے
یری لرزتی ہوئی رُوح کو پیس کر سُرمہ کر دیا۔ آخر نہایت یاس و ذلت میں میں نے اُس
ے پوچھا "آپ کے لنچ کا بل تین پنس سے زیادہ تو نہ ہوگا؟"
وہ "مجھے بھوک بہت لگی ہوئی تھی اس سے بہت زیادہ کا لنچ کھا گئی ہوں۔"
میں "افسوس مجھ میں آپ کا بل ادا کرنے کی توفیق نہیں ہے۔"
وہ "ایں! یہ کیوں۔"
میں (جھیپ کر) "میرے پاس بھی دام موجود نہیں۔"
وہ "تو پھر آپ کیا کیجئے گا؟"

میں (سر کھجا کر پھر جیب میں سے اپنا چرمی سگرٹ کا ڈبہ نکال کر اور بے ربطی و پریشانی کی تصویرین کر) "پھٹکار ہو مجھ پر اور میری اوقات پر۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں لیکن اں یہ تو فرمایئے۔ کہ آپ نے کھانے کے لئے کیا کیا چیزیں منگوائی تھیں"

وہ "مچھلی"

میں (فہرست طعام پر نظر دوڑا کر) "جس کے دام ڈیڑھ شلنگ ہوئے۔ آگے چلئے"

وہ "بھنی ہوئی بٹیر اور مٹر"

میں "دو شلنگ۔ کُل ساڑھے تین شلنگ ہوئے اور فرمایئے"

وہ "بالائی اور آڑوؤں کا مربّہ"

میں "ایک شلنگ اس کا لگایئے۔ اگر اسی قدر"

وہ۔ (بات کاٹ کر معذرت آمیز ندامت کے لہجہ میں) "میں نے ایک پیالہ کافی کا بھی پیا تھا"

میں "خیر چھ پنس اس کے ہوئے۔ ڈیڑھ اور دو ساڑھے تین اور ایک ساڑھے چار اور چھ پنس کل پانچ شلنگ ہوئے۔ یہ لیجئے پانچ شلنگ تین پنس ہیں۔ آپ اپنا بل تو ادا"

وہ "اور آپ ؟ کیا آپ بھی گھر سے بھاگ آئے ہیں ؟"

میں (بغلیں جھانک کر) "میرے باوا نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ اور حکم دیا ہے کہ فاقے کھینچا کرو"

وہ (ہنس کر) "اور آپ اس حکم کی تعمیل کر رہے ہیں۔ میرے ابا جان بھی نہایت وحشی واقع ہوئے ہیں۔ اور میرے خاوند کی تو کچھ پوچھئے ہی نہیں۔ ایسا بڈھا ہے کہ لاحول ولاقوۃ میری اُس کی شناسائی تین ہفتہ سے زیادہ کی نہیں ہے۔ کیا تماشا ہے !!"

اس وقت بہت سے احمقانہ بلکہ مجنونانہ لیکن ساتھ ہی دلفریب خیالات میرے دل و دماغ میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ دوڑ گئے۔ اور جب اس نے اپنی باتوں کے سلسلہ میں مجھ سے پوچھا کہ "اب آپ یعنی ہم اور آپ کیا کریں" تو مجھے ایسا محسوس ہوا۔ کہ میر

عظیم الشان زقند بھر کر یک بیک طارمِ اعلیٰ پر جا بیٹھا ہوں۔ اس سوال کے جواب
میں نے اوّل تو پانچ شلنگ تین پنس اُس کے حوالے کئے پھر آنکھ بچا کر اپنا جڑاؤ سگرٹ
کا ڈبہ اُس کے حوالے کیا۔ اور کہا کہ آپ اپنا بل ادا کیجئے۔ اور یہ ڈبہ گرو رکھ کر رقم میرے
حوالے کر لیتی آئیے۔ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ اور حیا کی سرخی نے اُس کی گردن اور رخساروں پر ایک
عجیب دلکش غازہ مل دیا۔ میری نظر رہ رہ کر حسن کے اس کرشمہ پر پڑی۔ اور یہ آرزوئیں چاک
گریباں کے بخیہ کی طرح پے بہ پے میرے سینہ میں اُبھریں۔ کہ کاش اس وقت ایک ویران جزیرہ
ہو۔ جس میں بجز اس دلربا کے اور میرے کوئی موجود نہ ہو۔ یا ایک کرایہ کی گاڑی ہو۔ جس کا
پردہ خوب چڑھا ہوا ہو۔ اور ہم دونوں پہلو بہ پہلو اُس میں بیٹھے ہوئے ہوں۔ غرض میری تجویز کے
جواب میں اُس نے کہا۔ کہ یہ تو مجھ سے نہ ہو سکے گا۔

میں: ”تو جس طرح بن پڑے کیجئے۔ اس میں رضامندی اور رغبت کو دخل نہیں۔ موقع
ہی ایسا آ پڑا ہے مجبوری سب کچھ کراتی ہے۔“

وہ: ”لیکن مجھے تو گرو رکھنا آتا ہی نہیں کسی چیز کو کس طرح گرو رکھتے ہیں۔“

میں: ”بس جائیے اور گرو رکھ آئیے۔ ہاں اسی طرح گرو رکھا جاتا ہے۔“

وہ (ہنس کر) ”وہاں جا کر میں یہی کہوں۔ تاکہ یہ سگرٹ کا ڈبہ گرو رکھ لو۔ اور
مجھے بیس پاؤنڈ دے دو۔“

میں: ”بس یہی۔ ہاں اتنا اور کہئے گا کہ رقم نقد چاہیئے۔“

وہ: ”اچھا جاتی ہوں۔ لیکن مجھے ڈر سا معلوم ہوتا ہے۔“

وہ اپنا بل ادا کر کے اور رسٹران کے خادم کو تین پنس بطور انعام دے کر جس پر
خادم نے کچھ بہت زیادہ اظہار رضامندی نہیں کیا اُٹھی اور میری طرف ایک مستانہ ادا
سے دیکھ کر چل دی ؎

دامن کشاں ہمیں شد در سلب ناز کشیدہ ۔۔۔ صد ماہ در وزتشکش جیب قصب دریدہ

یاقوت جاں فزایش زآب لطف زادہ　　شمشاد خوش خرامش در ناز پروریدہ

از تاب آتش مے بر گرد عارضش خوئے　　چوں قطرہائے شبنم بر برگ گل چکیدہ

آں لعل دلکشش بیں واں خندہ دل آشوب　　واں رفتن خوشش بیں واں گام آرمیدہ

مجھے اتنا تو یاد ہے کہ وہ جانے لگی۔ تو میں نے اُس سے یہ کہا کہ دل مضبوط کر کے بے دھڑک جائیے۔ بیس پاؤنڈ اگر ہمیں اس ڈبہ کے مل گئے۔ تو پھر ہم کو کسی چیز کی پروا نہیں لیکن اس کے جانے کے بعد مجھ پر خود فراموشی کا ایسا غلبہ ہوا۔ کہ میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ میں اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا مردآدمی معلوم ہوتا تھا۔ یا خرِ نامشخص۔ اور اس بے خودی کے عالم میں میں نے کیا کیا۔ اور کیا کہا۔ البتہ میٹھا میٹھا ریشم اور ساٹن مشک اور گلاب پھول اور شبنم سبزہ اور روشنی کے خواب دیکھتا رہا۔ آخرکار وہ خراماں خراماں بصد ناز و انداز آئی اور بولی۔ انہوں نے ڈبہ لیا۔ اور مجھے بارہ پاؤنڈ گن کر دے دیئے۔" یہ کہہ کر اُس نے بٹوا نکالا۔ اور اشرفیاں گن کر میز پر رکھ دیں۔ جن کی کھنک سے میں بدیں خیال خوف زدہ ہو گیا۔ مبادا آس پاس کے لوگ اسے سن پائیں۔ اور اسی سے میں نے چاروں طرف اس انداز کے ساتھ ایک مجرمانہ سی نگاہ ڈالی۔ کہ گویا اس روپیہ کے حاصل کرنے کے لئے کہیں ڈاکہ مار گیا ہی یا کسی کو قتل کیا ہے۔ روپیہ جیب میں ڈالتے ہی میں نے ایک نہایت ہی تمکنت آمیز لہجہ میں رسٹران کے ملازم کو بلایا۔ اور بل کی رقم جو دفعتہً بے حقیر و ہیچ میرز ہو گئی تھی ادا کر کے ملازم کو اپنی سابقہ عادت کے لحاظ سے پانچ شلنگ کا انعام دیا۔ اس کے بعد ہم دونوں رسٹران سے رخصت ہوئے۔ اور میں نے اپنی رفیق دل آرام سے دریافت کیا کہ اب کہاں کے ارادے ہیں

وہ (مسکرا کر) "اس کا تو میں نے خیال ہی نہ کیا تھا"

میں (مربیانہ لہجہ میں) "میں خوب جانتا ہوں کہ یہ بات آپ کے حاشیہ خیال میں بھی نہ گزری تھی لیکن یہ تو فرمائیے کہ آپ کا اسم گرامی کیا ہے۔ اس احقر کو لارنس رچرڈ ڈلسارٹ کہتے ہیں"

وہ "میرا نام فلیشیا اینی مرلن کورٹ ہے۔ میرے والد فرنچ ہیں اور والدہ آئرلینڈ کی

ہنے والی ہیں۔آپ کے پاس موٹر کار تو نہ ہوگی۔"
میں (اس فوری و ناگہانی سوال کی انوکھی نوعیت سے حیران و ششدر رہ کر) "مس
رن کورٹ کیا آپ یہ سمجھتی ہیں۔ کہ موٹر کاروں میں سوار ہونے والے ایسے تہید ست
و بے مایہ ہوتے ہیں کہ اپنے لنچ کا بل بھی نہیں ادا کر سکتے۔"
فلیشیا "سمجھتی تو نہیں لیکن ہم کو موٹر کار کی ضرورت اس وقت بے حد ہے۔"
میں "آخر معلوم تو ہو کہ کیا ضرورت ہے۔"
فلیشیا "میں ڈوور یا ارو یج یا جہاں کہیں بھی سینگ سمائیں جانا چاہتی ہوں۔"
میں (اس تجویز کے نشہ میں یک بیک چور ہو کر) "آپ جانا چاہتی ہیں تو میں بھی موٹر کار
کے لئے بہم پہنچا سکتا ہوں۔ اچھا تو میرے ساتھ ساتھ آئیے" غرض میں اور فلیشیا ہاتھ میں
ہاتھ ڈالے قریب ترین ٹیلیفون آفس میں گئے۔ اور میں نے ٹیلیفون کی گھنٹی بجا کر ڈورین
بلایا۔ دوسری طرف سے جو آواز آئی اسے سن کر میں نے کہا "ڈورین کیا تم ہو؟"
آواز "جی نہیں حضور وہ لندن سے باہر تشریف لے گئے ہیں۔"
میں "اخاہ ولیم تم ہو؟"
آواز "یہ تو میاں لارنس کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ جی ہاں میں ہی ہوں۔ مسٹر
ڈورین ڈیون شائر کو تشریف لے گئے ہیں۔ منگل تک لوٹیں گے۔"
میں "اچھا تو ولیم مجھے مسٹر ڈورین کی موٹر کار کی اس وقت سخت ضرورت ہے۔"
ولیم (دھیمے اور مشتبہ لہجے میں) "بہت اچھا میاں۔"
میرا سنہ چونکہ ٹیلیفون کی گھنٹی میں چھپا ہوا تھا۔ اس لئے موقع کو غنیمت جان کر
میں نے فلیشیا کے ہاتھ کو جو ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا دبایا۔ اور بجلی کی سی ایک رو میرے
تمام جسم میں دوڑ گئی۔
"اور سنو ولیم موٹر کار کو سیدھے میرے مکان پہ لے آؤ۔ اس کا خزانہ پٹرول سے

اچھی طرح بھر لینا۔ کیا؟ ہاں مسٹر ڈورین کو کل معاملہ کی خبر ہے۔ اچھا اب میں رخصت ہوتا ہوں۔"

ولیم:" بہت خوب میاں لارنس۔ میں موٹر کار ابھی لایا۔"

میں:" ہاں ولیم یہ تو میں کہنا بھول ہی گیا۔ کہ اگر تمہارے پہنچنے پر میں وہاں موجود نہ ہوں۔ تو میرے بڑے گلیڈ اسٹن بیگ میں دو تین دن کی ضرورت کے لائق کپڑے بند کر رکھنا۔ اچھا اب جاؤ۔"

فلیشیا کا ہاتھ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ اور اُس نے میری گرفت سے اسے چھڑانے کی کوشش نہ کی تھی۔ وہ خود تو میرے دل میں پہلے سے گھر کر چکی تھی۔ اب اُس کا مسیحی نام بھی اُس ساعت بساعت بڑھنے والی بے تکلفی کی بدولت جو مجھے اس کی جانب کھینچ رہی تھی۔ میرے دل سے میری زبان کے قریب آ رہا تھا۔ اور "تم" کا ربط آفریں قرب "آپ" کے تکلّف زا بُعد کی جگہ لینے کو تھا۔ جب ٹیلیفون میں میری اور ولیم کی باتیں ہو چکیں۔ تو فلیشیا نے جوشِ مسرت سے بے تاب ہو کر کہا "آپ تو ذہانت و فرزانگی کے پتلے ہیں۔ کہئے میں سچ کہتی ہوں یا نہیں؟"

میں:" اس میں کیا شک ہے۔ جب آپ کہتی ہیں تو میں اپنے وقت کا ارسطو و افلاطون ہوں۔ لیکن آپ ڈوور کیوں جانا چاہتی ہیں اور آپ کا سامان کہاں ہے؟"

فلیشیا:" میرا سامان چیرنگ کراس کے اسٹیشن پر رکھا ہوا ہے۔ اور میں ڈوور اس لئے جانا چاہتی ہوں کہ وہاں سے جہاز پر سوار ہو کر پیرس چلی جاؤں۔"

یہ سنتے ہی میں چکرا گیا۔ اس سے زیادہ حیرت افزا اور پریشان کن واقعہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ کہ مجھے کارپردازانِ قضا و قدر نے یک بہ یک ایک دل ربا نازنین کا ولی و سرپرست بنا دیا۔ جس کی میں نے اس سے پہلے کبھی صورت تک نہ دیکھی تھی۔ جس نے رسٹران میں مجھ سے مل کر اپنے ناشتہ کے دام ادا کرنے کی مجھ سے درخواست کی تھی۔ جو گھر سے کسی بات پر بگڑ کر نکل آئی تھی۔ جس نے میرا سگرٹ کا طلائی ڈبہ گرو رکھا تھا۔ جس نے مجھ سے ہوا

ـرایش کی تھی۔ جو اس بات کی متوقع تھی۔ کہ میں پیرس تک اُس کے ہمراہ چلوں گا۔ اور
ـں کے عشق میں میں مجنونانہ و خود فراموشانہ طور پر مبتلا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ آخر میں نے اسی
ـسرا سیمگی میں اُس سے پوچھا: "تم پیرس جانا چاہتی ہو؟"
فلیشیا (میری وضع سے کسی قدر کبیدہ ہو کر اور آنکھوں میں آنسو بھر لا کر) "ہاں لیکن تم
سے ناراض تو نہیں ہو؟" ان لفظوں نے ستم ڈھا دیا۔ میرے دل میں اس وقت صرف
ـ جذبہ کی گنجایش تھی۔ مجھے غصہ کہاں سے آتا۔ چنانچہ دل کی اسی کیفیت کا اظہار میں نے
ـطرح کیا: "ناراض؟ میں اور تم سے ناراض!! یہ کیونکر ممکن ہے تم؟"
فلیشیا (اس ڈر سے کہ میں کسی نہایت ہی پُرجوش خیال کا اظہار کیا چاہتا ہوں۔ قطع کلام
ـکے) "تم بڑے اچھے ہو۔ تمہاری ہر ایک بات اچھی ہے۔ لے اب چلو۔ اور اسٹیشن سے
ـا سامان لواتے لاؤ۔"
یہ کہہ کر فلیشیا نے منت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور میرا بازو پکڑ کر آگے
ـینچا۔ کیوں کر ممکن تھا۔ کہ اب بھی میں رُکتا۔ میں سر کے بل اور آنکھوں کے بل چلا۔ اور
ـں کے ساتھ ہو لیا۔ کچھ فاصلہ پر ایک کرایہ کی گاڑی کھڑی تھی۔ ہم دونوں اس میں سوار
ـگئے۔ اور گاڑی بان کو اسٹیشن چلنے کا حکم دیا۔ جب گاڑی روانہ ہوئی۔ تو میں نے فلیشیا سے
ـچا: "لیکن پیرس جاتی کس لئے ہو؟"
فلیشیا: "وہاں میرے بہت سے اعزا و اقربا ہیں۔ جو مجھے اس مصیبت سے جس
ـا ڈر رہی ہوں بچالیں گے۔ ہمارے پاس پیرس پہنچنے تک کے لئے روپیہ تو کافی
ہے نا؟"
میں (دبی زبان سے) "ہاں کافی ہے!"
چیرنگ کراس کے اسٹیشن پر پہنچ کر مسافروں کے سامان کے کمرے سے میں نے
ـمول دے کر ایک چمڑے کا صندوق کہ یہی فلیشیا کا سامان تھا لیا۔ اور ایک دوسرے

کرایہ کی گاڑی میں رکھوایا۔ اس کے بعد ہم دونوں جرمن اسٹریٹ کو روانہ ہوئے۔ جہاں ہ
مکان تھا۔ مکان کے دروازے پر پہنچے۔ تو ڈورین کی موٹر کار موجود تھی اور ولیم وردی پہنے
اس کے قریب کھڑا تھا۔ فلیشیا نے موٹر کار دیکھتے ہی خوشی سے تالیاں بجائیں۔ اور گاڑی
سے اُترتے ہی دوڑی ہوئی موٹر کے پاس گئی۔ اس نے اتنا بھی نہ کیا۔ کہ ولیم کو اس کا پٹ کھو
دے بلکہ خود ہی پٹ کھول کر اندر جا بیٹھی۔ اور اس کی گوناگون حرکات و سکنات سے جن
میں طفلانہ پن کی شان پائی جاتی تھی۔ اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ کہ وہ بے حد
مطمئن و مسرور ہے۔ اور موٹر کار کو گویا اپنی ملکیت سمجھے ہوئے ہے۔ اُس کا چرمی بیگ ہاتھ
میں لئے اُس کے پیچھے پیچھے میں بھی موٹر کار میں سوار ہو گیا۔ اور اگرچہ بظاہر میں متین و
سنجیدہ وضع بنائے ہوئے تھا۔ لیکن میرا دل ناقابل بیان آرزوؤں اور اُمنگوں کا
محشرستان بنا ہوا تھا۔

میں نے ولیم سے کہا کہ سیدھا ڈور کی سڑک پر پڑلے۔ سردی چونکہ خوب چمکی ہوئی
تھی لہذا اُس نے ہمیں کمبل اُڑھا دیئے۔ اور انجن کو حرکت میں لاکر چل دیا۔ موٹر ہوا سے
باتیں کر رہی تھی۔ دفعتہً ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ اور میں نے فلیشیا سے پوچھا۔ "
تمہیں موٹر ہی میں سفر کرنے کی کیا سوجھی۔ ریل کیا بُری تھی؟"

فلیشیا: "سفر تو ریل میں بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم موٹر میں نہ
آتے۔"

میں (اس بے معنی جواب سے چیں بجبیں ہو کر) "کس نادان سے پالا پڑا ہے۔"

فلیشیا (کمبل کے نیچے میرے ہاتھ کو ٹٹول کر اور اُسے خوب مضبوط تھام کر) "دیکھ
مجھ سے خفا مت ہو۔ کیا تم اتنا نہیں سمجھ سکتے۔ کہ اگر ہم ریل پر جاتے تو لوگ ہمیں دیکھ
لیتے اور میں پکڑی جاتی۔"

میں "کس کی مجال ہے کہ میرے ہوتے تمہاری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ سکے

فلیشیا (منہ بسور کر) "تم کو اصلی حال اگر معلوم ہو تو یہ نہ کہو"

اتنا کہہ کر اُس نے میرے ہاتھ کو اپنی انگلیوں سے حائل کر لیا۔ اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ ڈھائی گھنٹہ تک میں بیٹھا ہوا اُس کی صورت کو یعنی خدا کی قدرت دیکھا کیا۔ اور اپنی جگہ سے بال برابر بھی اس اندیشہ سے اِدھر اُدھر نہ سرکا۔ کہ مبادا اُس کی آنکھ کھل جائے۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مجھ سادہ لوح کے قلب پر اس وقت تک کیا کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ جب ہم ڈوور کے نواح میں داخل ہوئے۔ تو میں نے اُس کو جگانے کے خیال سے اُس کا شانہ پکڑ کر ہلایا۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ اور حالتِ سراسیمگی میں یہ لفظ اس کے مُنہ سے نکلے "میں ہرگز نہ جاؤں گی۔ میں کبھی نہ مانوں گی۔ ہیں۔ ارے۔ تم ہو۔ شکر ہے تم نے مجھے کیسا ڈرا دیا۔ میں سمجھتی تھی کہ میں پکڑی گئی" یہ کہہ کر اُس نے ایک انگڑائی لی۔ جس نے اُس کی شانِ رعنائی کو دوبالا کر دیا۔ اور پھر ایک دستی آئینہ کو ہینڈ بیگ سے نکال کر اور اپنے سامنے رکھ کر اپنے سرکش گیسوؤں کو جو بالوں کی جڑاؤ پن کی قید سے آزاد ہو گئے تھے سنوارنے لگی۔ میں نے آئینہ اُس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ اور کہا۔ "پہلے میری بات کا جواب دے لو۔ پھر آئینہ دیکھنا۔ یہ تم نے کیا کہا تھا۔ کہ تم پکڑی گئیں۔ وہ پکڑنے والا تمہارے خیال میں کون تھا"

فلیشیا "میں سمجھتی تھی ابا جان نے مجھے پکڑ لیا اور مجھے میرے خاوند کے حوالے کر دیا"

یہ سُن کر میں نے اس کا ہاتھ اُٹھایا۔ اور اس کی نورانی انگلیوں کو کتخدائی کے چھلے سے خالی پا کر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور پوچھا "تم عروسی کی انگشتری تو پہنے ہوئے ہو ہی نہیں۔ پھر یہ خاوند کیسا؟"

فلیشیا "یہ میں نے تم سے کب کہا تھا کہ میری شادی ہو چکی ہے"

میں (سر جھکا کر حیرانی کے لہجہ میں) "شادی بھی نہیں ہوئی اور خاوند بھی موجود ہے یہ کیا معاملہ ہے۔ از برائے خدا اسے حل کرو"

فلیشیا (قہقہہ لگا کر جس کا سُر یلا زیر و بم میری روح کو وجد میں لے آیا) "کیسے احمق ہو کر اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے۔ فی الواقعہ میرا کوئی خاوند نہیں ہے۔ لیکن آیندہ شنبہ کے روز میں اُس سے بیاہی جانے والی تھی۔ اسی لئے تو میں گھر سے بھاگ آئی۔ مجھے اس سے سخت نفرت ہے۔"

میں "نفرت کی وجہ؟"

فلیشیا (مُنہ بسور کر اور رومال آنکھوں کے قریب لے جا کر روتی آواز میں) "نفرت اس لئے کہ میں اُسے جانتی تک نہیں؟"

میں (اس پادر ہوا منطق سے کھسیانا ہو کر اور نہ جان کر کہ کیا کہوں) "پِنڈ رو۔ مت۔ تم آنسو بہاؤ گی۔ تو مجھے ہیرے کی کنی کھلاؤ گی۔"

فلیشیا "میں ضرور، دوں گی۔"

میں "اے لو ہوٹل بھی آگیا۔ ولیم موٹر کار کو روک رہا ہے۔ اب تو نہ روؤ۔ تم جو کہو گی میں سچ ماننے کو تیار ہوں۔"

فلیشیا "اچھا نہیں روتی۔"

ان الفاظ کو اس لہجہ میں ادا کر کے کہ گویا مجھ پر کوئی بہت ہی بڑا احسان کیا گیا ہے۔ فلیشیا نے رومال آنکھوں کے آگے سے ہٹا لیا۔ ان کی نیلی گہرائی میں جس نور کی جھلک مجھے نظر آئی اُسے مروارید اشک کی آب و تاب سے بہت کم تعلق تھا۔ بلکہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ شوخی و شرارت کی کرنوں کی چمک ہے۔ میں نے ولیم کو روپیہ دے کر کہا۔ کہ پیرس کے دو ٹکٹ خرید ے۔ اور ہوٹل میں ناشتہ کی تیاری کی فرمایش کر کے موٹر کو واپس لے جائے۔ اور اگر میرے نام کا کوئی خط ہو۔ تو شام تک اسی ہوٹل کے پتہ پر بھیج دے۔

چونکہ جہاز کے روانہ ہونے میں ابھی کئی گھنٹہ کی دیر تھی۔ اس لئے میں فلیشیا کی دل آرام صحبت کو اپنی زندگی کی خوشیوں کا لب لباب سمجھا۔ اور ہم دونوں ایک چھوٹی سی میز پر جو ہوٹل

ے کھانے کے کمرے کے ایک کونے میں لگی ہوئی تھی۔ سب سے الگ بیٹھ کر کھانا کھانے
ے۔ اُس خوشی اُس راحت اُس سرور کی کیفیت کو میں کیا بیان کروں۔ جو اس وقت میرے
ب پر طاری تھی۔ فلیشیا میرے پہلو میں بیٹھی تھی اور میں سمجھ رہا تھا۔ کہ دونوں جہان کی نعمت
ں وقت میری مٹھی میں ہے۔ ہم باتیں کر رہے تھے کہ خدمتگار آیا۔ اور ایک چٹھی لایا۔ چٹھی
برے وفادار اور محتاط لازم ولیم کی تھی۔ فلیشیا اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگی۔ کہ کس کی چٹھی ہے
س میں کیا لکھا ہے۔ میں نے اُسے چھیڑنے کے لئے لفافہ جیب میں ڈال لیا۔ اور کہا
اُس وقت اس کا مضمون تمہیں سناؤں گا۔ جب مجھے لارنس کہہ کر پکارو گی۔ اس کا جواب
یشیا نے اگر کچھ دیا تو یہ دیا۔ کہ میرا منہ چڑا دیا۔ میں بھی اپنی دُھن کا پکا تھا۔ میں نے مسکرا کر
ا۔ کہ خط نہایت ہی ضروری ہے۔ اور میری یہ حالت ہے کہ جان و دل تمہاری نذر کر چکا ہوں
ط سننا ہو۔ تو مجھے لارنس کہو۔ کہو گی یا نہیں؟ اُس کے لعلِ لب کے گوشوں پر شرارت
ے بھری ہوئی مسکراہٹ پھول برسانے لگی۔ اور اُس نے ایک ایسے ستم ظریفانہ انداز
ساتھ جس نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ کہا کہ لارنس میں تمہیں لارنس کبھی نہ کہوں گی۔ اُس
ر آفریں جملہ کی لذت کو میں کن لفظوں میں بیان کروں۔ بے اختیار میں نے فلیشیا کو "میری
ن" کہہ کر پکارا۔ اُس نے یہ لفظ سن کر اپنی معشوقانہ لغزش پر اگرچہ "مسٹر ڈلسارٹ"
کر لکھا سا ریشمی پردہ ڈالنا چاہا۔ لیکن میں نے کہا۔ کہ اب بات بنانے سے کیا ہوتا ہے
مجھے کہلوانا تھا۔ وہ تو میں نے تمہارے مُنہ سے کہلوا لیا۔ غرض میں نے لفافہ چاک کیا
ر خط پڑھ کر فلیشیا کو سنایا۔ خط کا مضمون حسب ذیل تھا:۔

میاں لارنس۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ ٹکٹ اس لفافے میں بند کرتا ہوں۔ اور
ا کرتا ہوں کہ آپ کی مراد بر آئے۔ پانچ پاؤنڈ کا نوٹ بھی اس چٹھی میں ملفوف ہے۔ تھی تو یہ
ادبی لیکن میں جانتا تھا۔ کہ آپ کو روپیہ کی اس وقت بڑی ضرورت ہے۔ اس لئے نوٹ
فہ میں بند کر دیا۔ میں نے برسوں آپ کا نمک کھایا ہے۔ امید ہے کہ میری نمکخواری

میری بے ادبی کی عذر داری کرے گی۔ جب حضور کے پاس روپیہ ہو تو مجھے دے دیجئے گا۔

حضور کا وفادار خدمتگار

ولیم بیکر

میں نے خط میز پر رکھ دیا۔ اور چونکہ ولیم کی وفاداری اور محبت کا یہ ثبوت دیکھ کر میرا دل بھر آیا تھا۔ لہذا میں نے فلیشیا سے کہا۔ کہ دیکھو وفاداری ایسی ہوتی ہے۔ فلیشیا اپنی کرسی سے دفعتہً اُٹھی۔ اور اتنا کہہ کر کہ تم ٹھہرو میں ابھی آئی باہر چل دی۔ میں کہاں ٹھہرتا۔ اُس کے پیچھے پیچھے میں بھی چلا۔ کہ دیکھوں کہاں جاتی ہے اور کیا کرتی ہے۔ فلیشیا کمرہ سے نکل کر بے تحاشا بھاگی۔ اور بیرونی ہال میں پہنچی جہاں ولیم کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ قریب پہنچ کر اُس نے یک بیک ولیم کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ اور بولی کہ جی چاہتا ہے تم پر قربان ہو جاؤں یہ کہہ کر اُس نے ولیم کا بوسہ اس زور سے لیا کہ آس پاس کی ہوا گونج اُٹھی۔ ولیم ہکا بکا ہو کر میری طرف دیکھنے لگا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ میں نے فلیشیا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اُسے کشاں کشاں میز پر واپس لے آیا۔

فلیشیا کی اس معشوقانہ ادا نے میرے دل کو گوناگون جذبات کا بازیچہ بنا دیا۔ اور قریب تھا کہ مجھ سے بھی وہی احمقانہ حرکت سرزد ہو جو فلیشیا سے ابھی ابھی سرزد ہو چکی تھی۔ لیکن میں نے دل پر جبر کر کے اپنے آپ کو روکا۔ اور اپنی صورت اور لہجہ کو متین بنا کر کہا۔ کہ فلیشیا میں سوچ چکا ہوں ایک نہ ایک بات ہو کر رہے گی۔

فلیشیا (ہنستے ہوئے میرا مضحکہ اُڑا کر) "لارنس کا سوچنا غضب ہے ایک نہ ایک بات ضرور ہو کر رہے گی۔!"

میں "دیکھو فلیشیا تمسخر مت کرو۔ اور میری بات کان لگا کر سنو۔ اے لو منہ بھی چڑانے لگیں! فلیشیا از برائے خدا تھوڑی دیر کے لئے متین بن جاؤ اور منہ مت چڑاؤ۔"

فلیشیا "میں کب منہ چڑا رہی تھی؟ میں تو متین بننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اگر

ت مجھے زیب نہیں دیتی۔ تم ہی انصاف کرو کیا میں اسی وقت حسین نظر آتی ہوں۔ جب "
میں " او جادوگرنی کیا دل کے ساتھ میرا ایمان بھی چھین لے گی۔ فلیشیا دیکھو مسکرانا
ھے گھورنا موقوف کرو اور سنو "
فلیشیا " میں نہیں گھوروں! آپ بھی اپنے آپ کو اس قابل سمجھنے لگے! اچہ خوش!!!
میں (اس کے لہجہ کی بناوٹی حقارت کو نظر انداز کر کے) "گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں جہاز
ے کیلئے کو روانہ ہوتا ہے۔ اس پر تمہیں سوار کرا کے اور خدا حافظ کہہ کر واپس چلا جاؤں گا "
فلیشیا " ایں! کیا کہا؟"
میں " میری بات کوئی چیستان تو نہ تھی جو نہ سمجھی ہو۔ تمہیں بتاؤ کہ میں تمہارے ساتھ کیوں
سکتا ہوں "
فلیشیا (اپنی رسیلی احضری آنکھوں کی بجلیاں میرے خرمن دل پر کچھ دیر تک گراتے
ے بعد) " تم نہایت سنگدل اور مردم آزار واقع ہوئے ہو "
میں " یہ تو سمجھو مت کہ میں تمہارے ساتھ نہیں جانا چاہتا ہیں آنکھوں کے بل اور سر
تمہارے ہمراہ چلنے کو حاضر ہوں۔ لیکن دنیا کیا کہے گی "
فلیشیا " بھاڑ میں جائے دنیا۔ میں ان فقروں میں آنے والی نہیں تمہیں چلنا ہوگا۔ اور
ینا ہوگا "
میں " فلیشیا تم ابھی نادان ہو۔ دنیا کو نہیں سمجھتی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ تم ایک نگاہ
دل لے گئی ہو ~
مگر اور دل کا جتنا حوصلہ تھا تل گیا سا — نگہ کے تیر کا ہونا تراز و اس کو کہتے ہیں
میں ہزار جان سے تم پر نثار رہوں جس کا تمہاری زبان کو نہیں تو دل کو ضرور اعتراف ہوگا
نیا کی نظروں میں ابھی تک ہم بالکل اجنبی اور نا آشنا ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اس
پر اتفاقی ملاقات یا عارضی شناسائی کا پردہ ڈالا جا سکتا ہے۔ ایسی حالت میں تم خود

ہی غور کرو۔ کہ میں آج رات تمہارے ہمراہ کیونکر چل سکتا ہوں۔ صاف صاف یہی کیوں نہ کہہ دوں کہ تم الگ بدنام ہوگی۔ میں جدا رُسوا ہوں گا۔ سو دوست ہیں سو دشمن۔ خدا جانے کیا کیا قصّے تراشے جائیں گے۔ اور کیسی کیسی تہمتیں گھڑی جائیں گی۔

میری یہ باتیں سُن کر فلیشیا خاموش ہوگئی۔ اور بہت دیر تک کسی سوچ میں محو رہی۔ میں نے وقت دیکھنے کی غرض سے گھڑی دیکھنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ جس طرح میرا دل اندرونی جذبات کے برق آلود تلاطم سے ایک انداز خاص کے ساتھ لرز رہا تھا۔ اسی طرح میرا ہاتھ بھی شاید دل کی وجد آفریں کیفیت سے متاثر ہوکر گھڑی نکالتے وقت وقف ارتعاش تھا۔ گھڑی میں نے نکالی ہی تھی۔ کہ فلیشیا نے اپنے طلسم خموشی کو یک بیک یہ کہہ کر توڑا۔ کیا پیاری گھڑی ہے۔ ذرا دیکھوں تو!" میں نے کوٹ کے کالج میں سے زنجیر نکال کر گھڑی فلیشیا کے حوالے کی۔ جو اُس کے طلائی ڈھکنے کے نقش و نگار کو دیکھ دیکھ کر اس کی تعریف کرنے لگی۔ میں نے پوچھا وقت کیا ہے۔ تو اُس نے جواب دیا۔ کہ دس بجے ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی نورانی گردن ذرا بلند کرکے میرے شانوں کے اوپر سے کسی شئے کو اس طرح دیکھا کہ مجھے گمان ہوا کہ کوئی آرہا ہے۔ میں نے جو مڑکر دیکھا تو کسی کو نہ پایا۔ اور پھر جو پلٹ کر فلیشیا پر نظر ڈالی۔ تو اُس کی فتنہ زا نظریں گھڑی پر جمی ہوئی پائیں۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے گھڑی مجھے دے دی۔ اور میں نے وقت دیکھ کر کہا کہ فلیشیا ایک گھنٹہ میں تمہارے پاس اَور ہوں اس کے بعد۔

اس فقرہ کو میری ایک آہ سرد نے پورا کیا۔ جو فلیشیا کی جدائی کے خیال نے پیدا کر دی تھی۔ فلیشیا نے ایک قہقہہ لگایا جس کی سُریلی اُتار چڑھاؤ میں سو سو شرارتیں چھپی ہوئی تھیں۔ میں کسی قدر چیں بجبیں ہوا۔ وہ اَور کھلکھلا کر ہنسی اور کہنے لگی۔ اچھا چلو مجھے جہاز تک پہنچا دو۔ روانگی کے وقت ہم جہاز کے عرشہ پر بیٹھ کر باتیں کریں گے پھر تم چلے جانا"۔

غنیمت جانئے مل بیٹھنے کو   جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے

غرض میں نے فلیشیا کا سامان اُٹھوایا۔ اور اُس کے ساتھ جہاز پر اس خیال سے گیا
ے رخصت کر کے واپس خشکی پر آجاؤں گا۔ اور دوسرے دن پیرس میں اُس سے جاملوں گا
ن کو ٹھکانے سے رکھوا کر میں نے فلیشیا سے کہا۔ کہ اپنے اعزا و اقربائے مقیم پیرس
ے پتہ بتا دو۔ تاکہ اُنہیں تار دے دیا جائے۔ اور وہ اسٹیشن پر تمہیں لینے کے لئے
د ہوں۔ اس سوال کا جواب فلیشیا نے اگر کچھ دیا۔ تو یہ دیا۔ کہ مضطربانہ وضع سے
ے بازو کو خوب مضبوط پکڑ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔ کہ فلیشیا
ہے۔ اُس نے مضمحل آواز میں کہا۔ کہ میری طبیعت مالش کر رہی ہے۔ مجھے نیچے
و۔ یہ سُن کر میں بدحواس ہو گیا اور اس کا بازو تھامے ہوئے اُسے نیچے لے گیا۔ جہاں
ب کوچ پر جو جہاز کے کمرہ استراحت میں موجود تھی۔ آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔
میں کوئی بیس منٹ تک اُس کے پاس بیٹھا رہا۔ اور رہ رہ کر کیفیت مزاج اُس
د چھتا رہا۔ مگر وہ غنودگی آلود ہوں ہاں ہی میں مجھے ٹالتی رہی۔ اتنے میں اوپر سے
ں بجنے کی آواز آئی۔ اور اُس گھما گھمی نے جو جہاز کی آمد اور روانگی کا پتہ دیتی ہے۔
بتا دیا کہ میرے رخصت ہونے کا وقت قریب آپہنچا۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں
یا سے رخصت ہونے کی اجازت مانگی۔ مگر کہیں تیسری مرتبہ کی طلب اجازت پر اُس نے
یں کھولیں۔ اور نقاہت زدہ آواز میں مجھ سے پوچھا کہ وقت کیا ہے۔ ابھی تو تم آدھ
ہ اور ٹھہر سکتے ہو۔ میں نے جو گھڑی نکال کر دیکھی۔ تو فی الواقع جہاز کی روانگی میں تیس
ٹ باقی تھے۔

فلیشیا (کراہ کر) "میرا جی بیٹھا جاتا ہے"

میں (بدحواسی اور سراسیمگی کے لہجہ میں) "کوئی تسکین آور عرق بھی پی لو۔ کہو تو لپک
نڈی یا دودھ سوڈا لیتا آؤں۔ طبیعت زیادہ خراب تو نہیں"

فلیشیا "کوئی چیز میرے کلیجے کو مسوسے لیتی ہے۔ تم میرے پاس ہی بیٹھے رہو۔ اُٹھو

کرنہ جاؤ۔ تھوڑی دیر میں خود بخود اچھی ہو جاؤں گی۔"

میں (خوشی سے لرز کر) "اچھا بیٹھا رہتا ہوں"

فلیشیا (دس منٹ کے بعد) "اب میری طبیعت سنبھلنے لگی۔ پتہ لکھ لو تاکہ خشکی پر جاکر تار دے سکو" میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پنسل نکالنی چاہی۔ تو موجود نہ پائی۔ جہ کے خانساماں سے پنسل مانگنے کے لئے میں کمرۂ استراحت سے باہر نکلا۔ خانساماں کچھ پر کھڑا ہوا تھا۔

میں "خانساماں ذرا اپنی پنسل تو مجھے دے دینا"

خانساماں "لیجئے حضور یہ حاضر ہے۔ حضور نے اپنا سب سامان اپنے حجرہ میں تو رکھ دیا"

میں "میں فقط اپنے ایک دوست کو رخصت کرنے کے لئے جہاز پر آیا تھا"

خانساماں "میں حضور کا مطلب نہیں سمجھا"

میں "مطلب یہ ہے کہ میں آج رات آبنائے کے پار نہیں جا رہا ہوں"

خانساماں "لیکن حضور تو تشریف لئے جا رہے ہیں۔ جہاز کو لنگر اٹھائے ہوئے پانچ منٹ ہو چکے"

میں "ارے! یہ کیا!! وقت کیا ہے؟"

خانساماں نے جب مجھے وقت بتایا۔ اور میں نے اپنی گھڑی نکال کر دیکھی تو معلوم ہوا کہ میری گھڑی جس کے ساتھ فلیشیا کی نورانی انگلیوں نے رہ رہ کر کھانے کی میز پر اٹکھیلیاں کی تھیں۔ اصلی وقت سے آدھ گھنٹہ پیچھے تھی۔ کچھ دیر تک میں مبہوت بنا ہوا گھڑی پر ٹکٹکی جمائے کھڑا رہا۔ آخر میرے دماغ پر فلیشیا کی ناز آفریں شوخی کی روشنی پڑی۔ اور میں سیدھا کمرۂ استراحت میں پہنچا۔ جہاں فلیشیا صحت اور خوش طبعی کی گلابی تصویر بنی ہوئی بیٹھی تھی۔ مجھے اس نے دیکھا اور کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

میں "فلیشیا! اب بجز اس کے چارہ نہیں رہا۔ کہ تم میری ہستی کا نصف ثانی بن جاؤ۔ یہ
ت ہی ضروری ہے کہ میری تم سے فوراً نسبت ٹھہر جائے۔ جو کچھ اس وقت تک پیش آیا ہے
، کچھ کم قابلِ شکایت نہیں۔ تم مجھے بھگا کر لیتی آئی ہو۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا۔ کہ میں جہاز پر
د پڑوں لیکن یہ ہو کر رہے گا کہ میں تمہیں اپنے تئیں بدنام کرنے سے بچا لوں۔"

فلیشیا (منہ بنا کر) "اونہہ؟"

میں "تمہاری اس اونہہ نے ثابت کر دیا۔ کہ تم نزاکت اور دلفریبی اور نادانی اور
نائی اور ناعاقبت اندیشی کا ایک دلاویز مجموعہ ہو۔"

میری ان باتوں کو سن کر فلیشیا نے دلبرانہ ستمگری کے ایک نرالے انداز کے ساتھ اپنے
ں میں انگلیاں دے لیں۔ اور جب اس کی اس ناز آفرینی پر ایک پوپلے منہ والی سال خوردہ
یا نے جس کی شصت و پنج سالہ جھریاں فلیشیا کے نوزدہ سالہ گدرائے ہوئے حسن کو
کی نگاہ سے دیکھ رہی تھیں۔ نازک بھوں چڑھائی۔ تو میں نے جھک کر اس کے ایک
و کان پر سے ہٹا دیا اور کہا "تمہیں میری بات سننی ہو گی۔ اور جو کچھ میں کہتا ہوں۔ وہ
ں کرنا ہو گا۔ تم اس قابل نہیں ہو کہ اپنی خبر گیری خود کر سکو۔ اور چونکہ میرا دل اور میری جان اور
سم اور میری روح تم پر نثار ہو چکی ہے۔ لاحول ولا قوۃ میرا نطق بھی کیا ناکارہ ہے۔ کہ میرے
جذبات کی صحیح صحیح ترجمانی نہیں کر سکتا۔ خیر تمہیں سب کچھ معلوم ہے۔ اس تمہید سے میرا
صرف اس قدر تھا کہ تم نے اپنے آپ کو نہایت ہی غیر محتاط ثابت کیا ہے۔ اس لئے اس
ی کا علاج اب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں اپنی منسوبہ کہہ سکوں۔"

فلیشیا (خشمگیں لہجہ میں) "تمہیں بھی یہ حوصلہ ہوا!"

میں "یہ حوصلہ اس لئے ہوا کہ خود تمہارے سر پر تو اس وقت جنون سوار ہے
یں بوجہ اس غایت محبت کے جس کا نہاں خانہ تمہاری نگاہوں نے میرے دل کو بنا رکھا ہے
تمام باتوں کے سوچنے اور سمجھنے کی قابلیت رکھتا ہوں۔ جو میرے اور تمہارے لئے

مفید ہیں۔"

فلیشیا اپنی پوری قوت کے ساتھ نہایت برافروختگی کے لہجہ میں تیور بدل کر "تمہیں یہ باتیں کہنے کی کیونکر جرأت ہوئی؟ کیا میں ہر اُس مردوے کے اقوال و افعال اور حرکات و سکنات کی جواب دِہ ہوں جو اتفاق سے اُسی کشتی میں سوار ہو جس میں میں سفر کر رہی ہوں؟ کیا"

میں (فلیشیا کی اس بے مہری سے کسی قدر کبیدہ ہو کر مگر اس کبیدگی کو ظاہر کئے بغیر) "یقیناً جواب دہ ہو۔ اگر تم نے اِس مردوے کے ساتھ لندن میں ایک میز پر بیٹھ کر لنچ کھایا ہو۔ پھر اُسے موٹر میں اپنا ہم سفر بنایا ہو۔ پھر ڈنر میں بھی اُس کو ہم نوالگی و ہم پیالگی کی عزت بخشی ہو۔ پھر اُس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر کشتی تک آئی ہو۔ خصوصاً ایسی حالت میں تو ضرور ہی جواب دہ اور ذمہ دار ہو۔ جبکہ وہ ہزار جان سے تم پر شیدا ہو۔ لو اب غصہ کو تھوک ڈالو۔ اور جہاز کے عرشہ پر چلو۔ وہاں کھلی ہوا میں باتیں کریں گے۔ یہاں بیٹھے بیٹھے تو دم گھٹتا ہے۔"

فلیشیا میری بات کا کوئی جواب دیئے بغیر اُٹھی اور میرے ساتھ ہولی۔ لیکن ہم دو ہی قدم چلے ہوں گے کہ اُس نے ایک خانساماں سے پلٹ کر کہا کہ "تئیس نمبر کا کمرہ کہاں ہے۔ مجھے اس میں لے چلو میں بہت تھک گئی ہوں۔ اتنا کہہ کر وہ مجھ سے الگ ہو گئی خانساماں کے ساتھ اپنے حجرہ کی طرف چلی گئی۔ اُس کی اس حرکت سے میرے دل پر چھریاں چل گئیں۔ اور میں مبہوت و ششدر کھڑا ہوا اُسے دیکھ رہا تھا۔ کہ یکایک اس نے پلٹ کر مجھ پر ایک نگاہ ڈالی جس میں میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ شرارت زا کیفیتوں کی ایک دل کو موہ لینے والی جھلک پائی جاتی تھی۔ اس کے بعد وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ اور تھوڑی دیر کے لئے دنیا میری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔

جب جہاز کیلے میں لنگر انداز ہوا۔ تو فلیشیا عرشہ پر آئی۔ جہاں میں پریشانی و تشویش کی صورت بنا بیٹھا تھا۔ اُس کی مدبھری آنکھوں میں نیند کا خمار ابھی تک موجود تھا۔ میں نے بے حیا بن کر جیسا کہ ایک سچے عاشق کا شیوہ ہوا کرتا ہے۔ خود ہی سلسلہ سخن کو ان الفاظ

چھیڑا کہ حضور پر شاید ابھی تک تکان کا غلبہ ہے۔ میری اس لطیف طنز نے اُس کے گنجِ لب
شانی پر اور اُس کے نورانی بازوؤں کو ایک شکریں انگڑائی لینے پر آمادہ کیا۔

قصہ مختصر یہ کہ ہم جہاز سے اُترے۔ اور میں سامان چنگی خانہ میں چھوڑ کر اُسے ریلوے
ن کو لے گیا۔ اور اُسے ریل میں بٹھا کر چنگی خانہ کو مال چھڑانے کے لئے واپس گیا۔ جب
واپس آیا۔ تو فلیشیا سو رہی تھی۔ اور پیرس تک وہ برابر اسی طرح سوتی رہی۔ جب پیرس
ن قریب آیا۔ تو میں اُسے جگانے کے قصد سے جھکا۔ اس کی دلفریب صورت سے
وہ ہو کر شاید میں اسی عالم مسحوری میں اپنا چہرہ اُس کے چہرہ کے ضرورت سے
قریب لے گیا۔ جس طرح وہ موٹر میں گھبرا کر یک بیک بیدار ہوئی تھی۔ اسی طرح اب
وہ چونک کر اُٹھی۔ اور اس حرکت اضطراری کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ میرے گستاخ گر
ت میں ناکردہ گناہ ہونٹ اس کے عارض زیبا سے چھو گئے۔ لب و عارض کا یہ
فعال ارادہ کے عنصر کی آمیزش سے اس درجہ پاک تھا۔ اور یہ کل واقعہ گریز پائی
نمک برق یا تبسم شرارے اس قدر مشابہ تھا۔ کہ میں تو مارے شرم کے کٹ کٹ
ور اُس کے چہرے پر ایک رنگ آنے اور ایک رنگ جانے لگا۔ میں نے معذرت
ں بہا دیئے۔ اور اس فصاحت آمیز خلوص کے ساتھ عذر خواہی کی۔ کہ اُسے یقین
لیکن اس پر بھی ہم دونوں کے رخسارے تمتما رہے تھے۔ اور دونوں کی پیشانیاں عرق
ں سے تر ہو رہی تھیں۔

فلیشیا کی ہدایات کے بموجب میں نے گاڑی بان سے کہا۔ کہ ہمیں پرانڈ ہوٹل میں لے
ہوٹل میں پہنچے تو ور بان اونگھ رہا تھا۔ اول تو گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ اور ہماری
نا اُس پر مطلق اثر نہ ہوا۔ لیکن جب بہت کچھ چیخنے اور چلانے اور ٹوٹی پھوٹی
ی میں سمجھانے کے بعد اُس کی خواب آلودہ آنکھوں کی راہ سے ہمارا یہ استفسار
طلب اُس کے دماغ تک لے گیا۔ کہ ہوٹل میں سٹر مین دیر تک بھی فروکش ہیں

یا نہیں۔ تو اُس نے ہوٹل کے رجسٹر کی دیر تک ورق گردانی کرنے کے بعد اپنا مٹکا سا سر ہلا کر کہا کہ جناب وہ تو آج صبح انگلستان چلے گئے۔

یہ سننا تھا کہ فلیشیا کے تو گویا پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اور خود میرے چہرے کی گولائی بھی بتدریج بیضویت میں مُبدل ہونے لگی۔ آخر میں نے فلیشیا کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ بیچاری فلیشیا سے میرے اس سوال کا جواب بجز اس کے اور کچھ بن نہ پڑا۔ کہ نہایت بے کسی اور بیچارگی کے لہجہ میں پکار اُٹھی کہ میں نہیں جانتی کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ کہاں جاؤں۔ اتنے میں ہوٹل کے دربان نے جمائی لی۔ میں نے اس خمیازہ گری کی طرف سے مطلقاً خالی الذہن ہو کر فلیشیا سے کہا۔ کہ بہتر ہوگا۔ کہ مجھ سے شادی کر لو۔ اس کے جواب میں فلیشیا نے ترحم اور بیکسی سے بھری ہوئی ایک دیر پا نگاہ مجھ پر ڈالی۔ میں نے پوچھا۔ کہ کیا میں اس قابل نہیں ہوں۔ کہ تمام عمر اُس رستہ کے لئے جہاں سے تم کو گزرنا ہو۔ تمہارے گون کا قایم مقام اپنی پلکوں کو بنائے رہوں۔ رکتا ہوا جواب ملا۔ کہ اچھا۔ اچھا اگر تمہاری مرضی ہو۔ یعنی اگر تم کو اصرار ہو۔ تو مجھے شاید عذر نہ ہو۔ اب ہوٹل کے دربان نے اور زیادہ زور کے ساتھ جمائی لی۔ اور میں مسکرایا بلکہ ہنسا۔

اُس کے بعد مجھے یاد پڑتا ہے۔ کہ میں اور فلیشیا کامل تین منٹ تک ایک دوسرے کی صورت کو دیکھتے رہے۔ ہوٹل کی خاکستری دیواروں پر جو نیلاہٹ لئے ہوئے تھیں مجھے یک بیک ایسا محسوس ہوا۔ کہ ایک آفتاب جلوہ گر ہو گیا ہے۔ گوناگوں جذبات اور بوقلموں کیفیات کا ایک طوفان میرے سینے کے اندر بپا ہو گیا۔ اور نطق نے ان جذبات و کیفیات کو اس طرح ادا کیا:۔

"صحرا سے میں گلزار میں آ گیا۔ اسی کا نام جنت الفردوس ہے۔ کیا مجھ سے بڑھ کر خوش نصیب کوئی شخص دنیا میں ہوگا۔ ضرورت ہوئی تو کل میں اپنی گھڑی گرو رکھوں گا۔ اور کتخدائی کا چھلا خریدوں گا۔ دربان میڈم کے لئے ہوٹل میں ایک کمرے

نتظام کرو۔ مجھے نیند کیوں کر آئے گی۔ جس کی خوشی کا یہ عالم ہو۔ اُسے رات بھر گاتے
نا چاہئے۔ اب میں بھی جا کر گاؤں گا بلکہ ناچوں گا۔"

فلیشیا (مسکرا کر) "پاگل تو نہیں ہو گئے ہو۔ میں تم سے ہرگز ہرگز شادی نہ
ں گی۔"

تین منٹ بعد جب میں اُمید کے گلابی بادل کے کندھوں پر سوار ہوٹل سے
نکلا تو مجھے رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا۔ کہ رخصت ہوتے وقت فلیشیا نے مجھے اپنے
ں لب کی انگبیں نوشی سے محروم رکھنے میں کیا مصلحت سمجھی۔

سمجھا تو میں بھی تھا کہ مارے خوشی کے مجھے رات بھر نیند نہ آئے گی لیکن میں
یا۔ اور اس طرح سویا۔ کہ دیکھنے والوں کو گمان ہوتا کہ یہ اپنے تمام گھوڑے بیچ چکا
۔ صبح سویرے اُٹھ کر میں اُس ہوٹل میں پہنچا۔ جہاں فلیشیا ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ مجھے
ت کے کمرے ہی میں ملی۔ اور لرزتی ہوئی اور کانپتی ہوئی بدحواسی کے عالم میں
ں طرف بڑھی۔ وہ مڑ مڑ کر گھبرائی ہوئی نگاہیں اس انداز کے ساتھ ڈالتی جاتی تھی
یا کسی بھوت پریت کے دفعتہً نمودار ہونے کا خوف اُسے دامنگیر ہے۔ اور
ں بات جو اُس کے منہ سے نکلی یہ تھی "میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔ میں یہاں
ں رہ سکتی۔ وہ یہیں موجود ہے۔ اور ناشتہ کر رہا ہے۔ از برائے خدا مجھے
ں سے لے چلو۔"

میں (دل ہی دل میں کراہ کر) "پھر وہی شوریدہ سری و ہذیان سرائی! آخر
ت کیا ہے؟ کہو تو۔"

فلیشیا (دیوانہ وار) "کیا کر رہے ہو۔ چلتے کیوں نہیں؟"

میں (طوعاً و کرہاً اُس کے شاہانہ حکم کی تعمیل میں اُسے ایک دوسرے کمرے
لے جا کر اور کوچ پر بصد منت بٹھا کر) "لیکن اول یہ تو بتاؤ کہ وہ ہے کون؟"

فلیشیا۔ "میرا خ۔ رخ۔ خاوند۔ یعنی جو میرا خاوند ہونے والا ہے۔ وہ میری تلاش میں آیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ یہاں مجھے ہی ڈھونڈنے آیا ہے"

میں (کچھ دیر تک محو استعجاب رہ کر جس کے اثنا میں طرح طرح کے خیالات میرے دماغ میں دوڑ گئے) "فلیشیا یہ تم نے بُری سنائی۔ بنی ہوئی بات کچھ بگڑی سی نظر آتی ہے"

فلیشیا (آنکھوں میں آنسو بھر لاکر) "اگر اُس نے کہیں مجھے دیکھ پایا۔ تو تعجب نہیں کہ میں سٹرن ہو جاؤں۔ ل۔ لارنس کیا تم مخلصی کی کوئی تدبیر نہیں بتا سکتے"

میں "یقیناً بتا سکتا ہوں چلو میرے ساتھ آؤ"

یہ کہہ کر میں فلیشیا کو لئے ہوئے کمرہ سے باہر نکلا۔ اور جس حجرہ میں ٹیلیفون لگا ہوا تھا اس کا دروازہ کھول کر میں نے فلیشیا سے کہا۔ کہ تم باہر ٹھہرو۔ میں ٹیلیفون میں باتیں کرکے ابھی آیا۔ بات اصل میں یہ تھی کہ مجھے دفعتہً یاد آگیا تھا۔ کہ انگریزی سفیر متعینہ پیرس لارڈ کلیر گار ہیں۔ لارڈ کلیر گار میرے باوا کے اور خود میرے ایک قدیم کرمفرما تھے۔ اور ایک نکتہ مجھے دفعتہً ایسا سوجھ گیا تھا۔ جو اس تمام گتھی کو چشم زدن میں سلجھائے دیتا تھا۔ اس وقت گیارہ بجے تھے۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجا کر جو میں نے دریافت کیا۔ تو حسن اتفاق سے لارڈ کلیر گار کو سفارت خانہ میں موجود پایا۔

پانچ منٹ تک مجھ میں اور لارڈ کلیر گار میں سلسلۂ گفت و شنید جاری رہا۔ منت وسماجت۔ تاکید و تاسیس۔ اظہار و اصرار کا کوئی ایسا دقیقہ نہ تھا۔ جو میں نے اپنے بیان میں اُٹھا رکھا ہو۔ اُس نے اوّل تو میری درخواست کو رد کر دیا۔ پھر کسی قدر نرم ہو کر بہ لہجہ تذبذب اظہار تامل کیا۔ پھر ہنس کر میری بات کو ٹالنا چاہا۔ پھر ایک اور قہقہہ لگایا اور آخر میں یوں کہا "لارنس تیرے اُلّو ہونے میں مجھے جو رہا سہا شک تھا۔ وہ بھی جاتا رہا اے احمق جب تیرے باوا کو معلوم ہوگا کہ تو"

میں (بات کاٹ کر اس لہجہ میں کہ گویا میری درخواست منظور کر لی گئی ہے) "کس زبان اور
ں دل سے حضور کا شکریہ ادا کروں۔ جو قدیم خاندانی تعلقات مجھے جناب سے وابستہ
ے ہوئے ہیں۔ وہ اسی کے متقضی تھے کہ مجھ پر ایسی ہی نوازش مبذول فرمائی جائے۔"

یہ سن کر لارڈ کلیرکا رصاحب اپنی خودداری کو قایم رکھنے کے لئے کھانسے اور پھر
ہنسے۔ اس پر میں نے شکروامتنان کا پل از سرِنو یوں باندھا:۔ "جناب ہم دو بجے تک
ہو کر سفارت خانہ میں پہنچ جائیں گے۔ مجھ پر جو احسان جناب فرما رہے ہیں۔ وہ میں
ک نہ بھولوں گا۔"

لارڈ کلیرکارڈ "تمہیں واضح رہنا چاہیے۔ کہ اس مقدس رسم کی مکرر انجام وہی کی بھی
رورت ہو گی۔"

میں "جی ہاں مجھے خوب معلوم ہے۔ اس کی طرف سے مجھے ذرا بھی کھٹکا نہیں۔ اب
ے اجازت دیجئے۔ ہم دونوں ٹھیک دو بجے آپ کی خدمت میں پہنچ جائیں گے۔ اور آپ
شکریہ۔"

میں یہ جملہ ختم کرنے نہ پایا تھا۔ کہ ٹیلیفون کے تنگ حجرے کا دروازہ بڑے زور سے
ا۔ اور ریشم وسموز و عطر کا ایک لرزتا اور ہانپتا ہوا دلفریب مجموعہ اندر داخل ہوا۔ اور
دازہ اسی زور سے پھر بند کر دیا گیا۔ میں نے جو حیران ہو کر نگاہ ڈالی۔ تو فلیشیا
جو اسی کے عالم میں یہ کہتے ہوئے سنا کہ وہ آ رہا ہے۔ میں نے اُسے قہوہ خانہ کے
واز ے سے نکلتے ہوئے اپنی آنکھوں دیکھا۔ از برائے خدا مجھے یہاں سے جلد لے
۔ وہ کہیں مجھے دیکھ نہ لے۔"

میں "کیا نادان ہو۔ اس قدر کیوں سہمی جاتی ہو۔ کس کی مجال ہے جو میرے پاس موجو
تے۔ تمہاری طرف نگاہ بھر کر دیکھ سکے۔ ذرا مت ڈرو۔"

فلیشیا" اس نے اگر کہیں مجھے دیکھ لیا۔ تو میرا دم ہی تو نکل جائے گا۔ یقین مانو کہ میری

ہستی کا نقش تک مٹ جائے گا۔"

میں "فلیشیا؟"

فلیشیا "کہو۔"

میں "تمہیں میری بیاہتا بی بی بننا پڑے گا۔"

فلیشیا "ہرگز نہیں! یقیناً نہیں!!"

اس پر مجھے ایک شرارت سوجھی۔ میں نے دروازہ کا پیچ پکڑ کر ایک انداز خاص سے فلیشیا کی طرف دیکھا۔ وہ میرا مطلب سمجھ گئی۔ لیکن اپنی آن دلیرانہ قایم رکھنے کے لئے جی کڑا کرکے بولی کہ یقیناً تمہارے ساتھ شادی نہ کروں گی۔ اس پر میں نے دروازہ کو تھوڑا سا کھول دیا۔ اُس نے چاہا کہ دب سمٹ کر کواڑ کے پیچھے چھپ جائے۔ لیکن اس تنگ صندوق نما حجرے میں اتنی جگہ نہ تھی۔ میری اس دھمکی نے اُس کی ضد کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ اور وہ کہنے لگی۔ کہ ہرگز ہرگز تمہارے ساتھ عقد نہ کروں گی۔ اب تو میں نے دروازہ کو اپنی آنکھ کی طرح بالکل ہی کھول دیا۔ اُس نے جب جھانک کر دیکھا۔ کہ باہر کوئی نہیں۔ تو اطمینان کے لہجہ میں کہنے لگی۔ کہ وہ چلا گیا۔ اب تمہارا جادُو مجھ پر نہیں چلتا۔ میں ہرگز تم سے شادی نہ کروں گی۔ اُس نے کہنے کو تو یہ بات کہی۔ لیکن اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ میں بھی اپنی دُھن کا پکا اور اپنی بات کا دھنی تھا۔ اسی لَے کو بڑھاتے ہوئے میں نے کہا۔ کہ اچھا نہیں شادی کرتی ہو تو جاؤ سیدھی شیر کے منہ میں چلی جاؤ۔

فلیشیا "لارنس دیکھو۔ ایسے بے رحم اور وحشی مت بنو۔ کیا تم کو میرے حال پر رحم نہیں آسکتا۔ کیا؟"

میں "مَیں بے رحم بھی ہو سکتا ہوں اور وحشی بھی۔ تمہیں مجھ سے شادی کرنی ہو گی میں دیکھتا ہوں۔ کہ خدا نے مجھے اسی لئے بنایا تھا کہ تمہاری خبر گیری کیا کروں۔"

فلیشیا "میں ہرگز تم سے شادی نہ کروں گی۔ ہرگز نہ کروں گی۔ کبھی نہ کروں گی۔"

یں "اچھا دیکھا جائے گا۔ مگر تم اس ناکارہ جگہ سے تو نکلو۔ جہاں تمہارا وہ کھوسٹ
ا موجود ہے۔"

یں اور فلیشیا ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوٹل سے باہر نکلے۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد تھا
ہ لرز رہی تھی۔ لیکن گاڑی میں بیٹھتے ہی اس کی زردی گلابی رنگت سے بدل گئی۔ اس کی آنکھ
وخی و شرارت رقص کرنے لگی۔ اور اُس کا لب لعل تبسم کی کلیاں بکھیرنے لگا۔ میں نے کوچبان
ی لایانئے کے بازار کی طرف چلنے کا حکم دیا۔ اور جب فلیشیا نے پوچھا۔ کہ یہ کیوں۔ تو
ے اس مختصر سے جواب پر اکتفا کیا۔ کہ تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔ ذرا انتظار تو کرو۔ غرض
یں پہنچ کر میں ایک دُکان پر ٹھہرا۔ جہاں مجھے فلیشیا سے مشورہ کئے بغیر ایک خاص چیز
ی تھی۔ یہاں سے ہم آگے بڑھے۔ اور دیر تک شہر کے مختلف حصوں کی سیر کرتے ہوئے
کے قریب انگریزی سفارت خانہ میں پہنچے۔ گاڑی کے دریچے میں سے سر نکال کر میں نے
ے تو کہا۔ کہ گاڑی ٹھیرائے رکھے۔ اور پھر پلٹ کر فلیشیا سے پوچھا۔ کہ اب بتاؤ۔ مجھ سے
کرو گی یا نہیں۔ اور کرنا چاہتی ہو یا نہیں۔ اس سوال کے جواب میں وہ پہلے تو ہنسی۔
یا نداز نفی سر ہلا دیا۔ لیکن یہ بات مجھ سے چھپ نہ سکی۔ کہ اُس کے لبوں کو ایک خاص
اضطراری جنبش ہو رہی ہے۔ یہ دیکھ کر میں نے اپنے سوال کا پہلو یوں بدلا: "فلیشیا اب
کو واپس جاؤ گی؟"

فلیشیا "لارنس یہ تو مجھ سے کبھی نہ ہوگا۔"

میں ۔"تم مجھ سے شادی بھی نہیں کرتی۔ ہوٹل کو واپس بھی نہیں جاتی ہو۔ اتنا روپیہ تمہارے
رے اور تمہارے پاس ہے نہیں۔ کہ انگلستان پہنچ سکیں۔ پھر بتاؤ۔ کہ کیا کرنا چاہتی

فلیشیا (پہلے ہنس کر پھر چیں بہ جبیں ہو کر) "کیوں نہ تمہاری وہ پیاری گھڑی گرو رکھ
ے جو وقت غلط بتایا کرتی ہے۔"

اب تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ اس شوخ و شنگ مہ پارہ کی محبت کا جو طوفان میرے سینے
میں متلاطم ہو رہا تھا۔ اُس کی پوری قوت میں نے اُس کی سرکش طبیعت کو اپنے ارادہ کے
تابع کرنے پر صرف کر دی۔" فلیشیا سنو۔ تھوڑی دیر کے لئے متانت سے کام لو۔ اور ضد
چھوڑ دو۔ میں جو بات تم سے کہتا ہوں۔ وہ میرے دل کے سب سے زیادہ چھپے ہوئے
کونے میں سے نکلتی ہے۔ میں تم پر سو دل سے ہزار جان سے شیدا ہوں۔ اس پر بھی میں اصلی
حقیقی جذبات کی ترجمانی کرنے پر قادر نہیں۔ اور اس کی مجھے ضرورت بھی نہیں۔ تمہارا دل سب
کچھ خود جانتا ہے۔ سنو خدا کے لئے سنو۔ اور میری بات کا جواب دو۔ کیا تم مجھ سے
شادی کرو گی یا نہیں؟ تمہارے دل۔ دماغ۔ روح اور جسم کے ذرہ ذرہ سے مجھے عشق
ہے۔ تمہارا دل افروز حسن۔ تمہاری دل آرا ادائیں۔ تمہارے دل فریب انداز۔ تمہاری
دل آویز ہستی کس کس نے مجھے اپنا دیوانہ نہیں بنایا۔ کیا تم کسی ایسے بڈھے کھوسٹ سے
خواہ مخواہ شادی کرو گی۔ جس سے تم کو دلی نفرت ہے؟" اب بتاؤ کہ مجھ سے شادی
کرو گی یا نہیں؟"

یہ الفاظ میں نے اُس تمام جوش کے ساتھ کہے تھے۔ جس پر میں قادر تھا۔ اور انہیں ادا
کرتے وقت میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں دبا لیا تھا۔ شاید میرے
ہی جوش و خروش کا اثر تھا۔ کہ اُس کے تنفس کی حرکت تیز ہو گئی۔ اور اُس کے ہونٹ جذبات
قلبی کے کسی اندرونی تموج سے اثر پذیر ہو کر لرزنے لگے۔ میں اس انتظار میں تھا۔ کہ کب اُس
کے منہ سے کوئی ایسا جملہ نکلتا ہے۔ جس سے میری جان میں جان آئے۔ اسی بے تابی کے
عالم میں جو بیم و رجا کے دونوں پہلو لئے ہوئے تھا۔ میں نے اُس سے پھر کہا:۔ فلیشیا
خدا کے لئے میری بات کا جواب دو۔ مجھ سے شادی کرو گی یا نہیں؟ سفارت خانہ میں
بلا تاخیر مزید ہمارا نکاح ہو جانا چاہیئے۔ میں نکاح خوانی کا انتظام کر چکا ہوں۔ پادری
ہمارا منتظر ہے۔ فلیشیا اب تو جواب دو۔ کہ عقد پر رضامند ہو یا نہیں؟"

فلیشیا (دھیمی آواز میں) "میرے ہاتھ چھوڑ دو۔ اور اپنی آنکھیں بند کر لو۔ اور نہ جگہ سے ہلو نہ میری طرف دیکھو۔"

اس حکم کی تعمیل میں نے کی ہی تھی۔ کہ دو نور کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہاتھ میری گردن میں حمائل ہو گئے۔ دو مرجان کے ترشے ہوئے برق آلود ہونٹ میرے رخسار سے پیوست ہو گئے۔ اور

لیکن میں نے ہاتھ پھیلائے تو ہم آغوشی کے لئے بجز موج نسیم کے اور کسی کو موجود نہ پایا۔ گاڑی کا دروازہ چٹکی بجاتے میں کھل چکا تھا۔ اور فلیشیا چھلاوہ سی نکل کر سفارت خانہ کے زینے تک پہنچ چکی تھی۔ مجھ پر نیم مدہوشی کا عالم طاری تھا۔ گاڑی والے کو کرایہ دے کر میں سفارت خانہ میں فلیشیا کے ساتھ داخل ہوا۔

× × × ×

جب ہم ہوٹل کو واپس آئے تو چار بج چکے تھے۔ اس وقت میرا دماغ ساتویں آسمان پر تھا۔ وہ بے پایاں خوشی جو ایک نوعروس کے شوہر کو عقد کے بعد ہوا کرتی ہے۔ میرے دل میں اسی طرح دوڑ رہی تھی۔ جیسے نئے گلرنگ میں سرور دوڑا کرتا ہے۔ اسی عالم انبساط میں دنیا و مافیہا سے غافل ہو کر میں نے اپنی بی بی سے کہا۔ کہ اب اُس بڈھے جھڑوس سے کہو۔ کہ میرے سامنے آئے۔ ناک پر تاک کر دو گھونسا رسید کیا ہو کہ۔

بس فقرہ ختم کرنے نہ پایا تھا۔ کہ فلیشیا نے ایک چیخ ماری اور میرا ہاتھ چھڑا کر دیوانہ وار سیڑھیوں کے اوپر چڑھ گئی۔ اُس کی اس حرکت سے میں ہکا بکا رہ گیا۔ اتنے میں کسی کے قدموں کی چاپ میرے کان میں پڑی۔

پلٹ کر جو دیکھتا ہوں۔ تو میرے باوا جان آ رہے تھے۔ کچھ نہ پوچھو کہ اُنہیں دیکھ کر میرے قلب پر کیا کیفیت طاری ہوئی ہیں۔ زمین میں گڑ ہی تو گیا۔ میرے بدن کو اگر اس

وقت کاٹا جاتا تو لہو کی ایک بوند نہ نکلتی۔ اُن کا چہرہ مارے غصہ کے سرخ ہو رہا تھا۔ اور اس سرخی کو اُن کے سفید گلپھوں نے اور بھی زیادہ نمایاں کر دیا تھا۔ قریب پہنچ کر اُن کا چہرہ مجھے دہکتے انگاروں کی طرح نظر آیا۔ میرے پاس آکر انہوں نے چاہا۔ کہ حسبِ معمول مجھ پر برس پڑیں لیکن فرطِ غیظ و غضب نے تکلم کی اجازت نہ دی۔ بہرحال میں انہیں ہوٹل کی لائبریری میں لے گیا۔ جب وہ کرسی پر بیٹھے ہیں۔ تو ان کی آنکھیں مارے غصے کے پھٹی پڑتی تھیں۔ سانس دھونکنی کی طرح پھولی ہوئی تھی۔ بات مُنہ سے نکالنا چاہتے تھے لیکن قہر آلود زبان یاری نہ دیتی تھی۔ میں ساکت و صامت برابر پاس کھڑا رہا۔ آخر بہ ہزار دشواری اُن کے قہر و غضب کی بجلی مجھ پر یوں گری :۔

"ابے۔ ابے۔ ابے گدھے کے بچے۔ پاجی۔ بدمعاش۔ نالایق۔ یہ تو"

میں "حضور آخر مجھ سے کیا خطا سرزد ہوئی ہے جو مجھ پر اس قدر عتاب"

میرے باوا "بک مت۔ خبردار جو بڑھ کر بات کی۔ میں تجھے عاق کردوں گا۔ ایک کوڑی نہ دوں گا۔ ابے ناخلف۔ نابکار۔ یہ تو میری۔ م۔ م۔ منگیتر"

یہ لفظ سُن کر یک بیک کل حقیقت مجھ پر منکشف ہوگئی۔ اور میرا مغز استخوان تک منجمد ہوگیا۔ آخر جب میری لکنت زدہ زبان نے یاری دی۔ تو میں نے کہا کہ ابا جان جسے آپ نے دیکھا تھا۔ وہ تو میری بیاہتا بی بی ہے۔ مجھے ڈر تھا۔ کہ کہیں یہ بات سُن کر میرے باوا پر فالج نہ آگرے۔ اس لئے میں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ دو چار مزید جملوں میں کل حقیقت بیان کرکے جس قدر جلد ممکن ہو ان کے پاس سے چلا جاؤں۔ چنانچہ میں نے منت وسماجت اور لابہ و خوشامد کے لہجہ میں عرض کیا۔ کہ آبا جان میری اور اُس کی شادی ہوچکی ہے آپ نے فرمایا تھا۔ کہ مجھے ضرور شادی کرلینی چاہئے۔ اس لئے میں نے آپ کے ارشاد کی تعمیل کی اور آپ مان جائیں گے۔ کہ وہ اس قابل ضرور ہے۔ کہ ہمارے گھرانے کی عزت کو برقرار رکھ سکے۔ اب ہمارے پاس خرچ کو ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ فلیشیا کو

اُس کی عروسی پر جو تحفہ میری طرف سے ملا ہے وہ یہ ہے۔ اُمید ہے کہ میرے پیارے ابا جان ہم دونوں کے حال پر بے پایاں شفقت مبذول فرمائیں گے۔

یہ کہہ کر میں نے وہ ٹکٹ جو سگرٹوں کے ڈبہ کے گرد رکھنے کی رسید کے طور پر مجھے ملا تھا۔ ابا جان کے سامنے رکھ دیا۔ اور خود دوسری منزل پر جہاں فلیشیا کا کمرہ تھا چلا گیا۔ میں نے زینہ طے کیا ہی تھا۔ کہ سامنے مجھے فلیشیا آتی ہوئی ملی۔ اور میں نے سب ماجرا اُسے کہہ سنایا۔

تولہ بھر ریڈیم

کچھ دن ہوئے۔ لندن کے چند بےفکروں نے ایک جگہ جمع ہو کر یہ سوچنا شروع کیا کہ تفریح و دلچسپی کا ایسا کونسا مشغلہ ہو سکتا ہے۔ کہ وقت بھی بڑے مزے میں گذرے۔ اور گرہ سے بھی کچھ خرچ نہ ہو۔ یہ لوگ انگریزی سوسائٹی کا خلاصہ اور انگلستان کی شرافت کا عطر تھے ان میں سے کوئی ڈیوک تھا۔ کوئی بیرن۔ کوئی پارلیمنٹ کا ممبر تھا۔ اور کوئی فوجی افسر سب کے سب مجرد تھے۔ اور اُس آزادی کے صدقے میں جس کے لحاظ سے انگلستان کے مرد و عورت زبان زد خاص و عام ہیں سبھی طرح کے گلچھرے اڑا چکے تھے۔ کوئی ایسی ہوس نہ تھی۔ جو انھوں نے پوری نہ کی ہو۔ اور کوئی ایسا پاپڑ نہ تھا۔ جو انھوں نے نہ بیلا ہو۔ زندگی کا لطف خاص طور پر حاصل کرنے کے لئے اب انہیں کسی مشغلہ کی ضرورت تھی۔ جو بڑا ہی انوکھا ہو۔

سوچتے سوچتے آخر ایک کی طبیعت لڑ گئی۔ اور اس نے یہ تجویز پیش کی۔ کہ ہم لوگ ایک انجمن نقب زنی قایم کریں۔ جس کی رکنیت کی فیس یہ ہو کہ ہر رکن سال میں ایک دفعہ لندن کا کوئی گھر جسے صدر انجمن صاحب تجویز کریں پھوڑا کرے۔ اس تجویز پر سب نے باشتیاق تمام صاد کیا۔ اور ایک باقاعدہ انجمن نقب زنی قایم ہو گئی۔ جس کے ارکان کی

نداد ایک رکن کی تحریک کی بنا پر الف لیلہ کے مشہور علی بابا اور چالیس چوروں والے
نہ کی مناسبت سے چالیس تھی۔

ایک دن جب بعض ضروری امور پر غور کرنے کے لئے اس انجمن کا باقاعدہ اجلاس ہوا
صدر انجمن نے پہلے تو بلا کسی تمہید کے حاضرین سے یہ کہا کہ ریڈیم جیسی نایاب چیز بمقدار کثیر موجود
ہے۔ اور اس کے بعد جیب میں سے ایک اخبار نکال کر حسب ذیل عبارت پڑھنی شروع کی:۔

"کچھ عرصہ ہوا کہ آدھ سیر ریڈیم کی قیمت آٹھ لاکھ چھیانوے ہزار پاؤنڈ (ایک کروڑ چوبیس
چالیس ہزار روپیہ) بتائی گئی تھی۔ جن جن لوگوں کے پاس اس نادر الوجود عنصر کی کوئی مقدار
رض فروخت موجود ہو۔ انہیں ہم مشورہ دیتے ہیں۔ کہ جہاں تک جلد ممکن ہو۔ اسے علیحدہ
الیں۔ کیونکہ پروفیسر بلتھ نے اس عنصر کے بمقدار کثیر بہم پہنچانے کا ایک حیرت انگیز طریقہ
ت کر لیا ہے۔ چنانچہ اس طریقے کے مطابق پروفیسر موصوف نے تولہ بھر ریڈیم جس
یت بازار کے بھاؤ سے تین لاکھ چونسٹھ ہزار روپے ہوتی ہے تیار کر بھی لی ہے اور چند خاص
ن ماہرین علم کیمیا نے پروفیسر بلتھ کے کارخانہ میں جا کر اس کی اصلیت کے متعلق اپنی تشفی کر لی ہے۔

"معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانہ جلد آنے والا ہے۔ جب ریڈیم نظری دنیا سے عملی دنیا میں
نے گی۔ اور اس کا شمار تمدن کی بڑی قوتوں میں ہونے لگے گا۔ چونکہ اس عجیب و غریب عنصر
یک چھوٹے سے ٹکڑے میں یہ تاثیر موجود ہے کہ ایک متوسط الحال شخص کے آتش دان
ہزار سال تک کوئلہ کی احتیاج سے مستغنی رکھ سکے۔ لہذا ظاہر ہے کہ زمانہ آئندہ میں یہی
حرارت کا مخزن و مصدر بننے والا ہے۔ ہمارے بڑے بڑے شہروں میں دھوئیں کی وجہ
آج کل جو تکلیف ہوتی ہے وہ بالکل جاتی رہے گی۔ دخانی جہازوں کو کوئلہ کی ضرورت
نہ رہے گی۔ اور کوئلہ کی کانوں کے بیکار ہو جانے کی وجہ سے کوئی دس لاکھ مزدوروں
ش کی کوئی دوسری شکل نکالنی پڑے گی۔"

ایک رکن "ہوگا تو بڑے مزے کا زمانہ۔"

دوسرا رکن: "لیکن اسے ہماری آج کی کارروائی سے کیا تعلق؟"

صدر انجمن: "مجھے بات تو پوری کر لینے دی ہوتی اس کے بعد تو کا ہوتا۔"

دوسرا رکن: "ارشاد ہو۔ ہم ہمہ تن گوش ہیں۔"

صدر انجمن: "ہمارے سکرٹری صاحب نے جو سالانہ رپورٹ پیش کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میجر جیرلڈ براؤن کا چندہ بابت سال گذشتہ ابھی تک وصول نہیں ہوا۔ لہٰذا میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ میجر براؤن یہ تولہ بھر ریڈیم مالیتی تین لاکھ چونسٹھ ہزار روپیہ پروفیسر لیتھ کے مکان سے لاکر انجمن کے اجلاس آئندہ میں پیش کریں۔ اگرچہ ساتھ ہی میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ معزز انجمن کی رکنیت کی شان اس سے بہت اونچی ہے کہ تین لاکھ چونسٹھ ہزار روپیہ جیسی ہیچ میرز رقم اس کے برقرار رکھنے کا کافی معاوضہ ہو سکے۔

اس فیصلہ کی تعمیل کے خیال سے گذشتہ ماہ اپریل کی پہلی تاریخ کو آدھی رات کے وقت میجر جیرلڈ براؤن پروفیسر لیتھ کے مکان واقع لڈگیٹ سرکس کے پچھواڑے کی دیوار پھاند کر مکان کے اندر داخل ہوئے۔ میجر صاحب کا طرز عمل وہی تھا۔ جو ایک معمولی چور کا ہوتا ہے۔ آپ کھڑکی توڑ کر ایک کمرہ میں گھسے۔ یہ کمرہ پروفیسر کا معمل یا دارالتجربہ تھا۔ چونکہ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ لہٰذا میجر براؤن نے جیب میں سے ایک چھوٹی سی برقی لالٹین نکال کر روشن کی۔ اور ہر طرف نگاہ ڈالی۔ سامنے ایک دروازہ نظر آیا۔ جو صرف ایک چٹخنی کے ذریعہ سے بند تھا۔ چٹخنی کھول کر وہ آگے بڑھا۔ کچھ دُور جا کر دہنے ہاتھ کی طرف ایک دروازہ اور دکھائی دیا جس کے پٹ بالکل کھلے تھے۔ دروازہ میں سے اُسے جو کچھ نظر آیا۔ وہ اُسے محو حیرت و استعجاب کرنے کے لئے کافی تھا۔ کمرہ کے وسط میں میز پر ایک چمکدار چیز رکھی ہوئی تھی۔ مقابل کی دیوار پر کوئی ایک فٹ مربع جگہ اس چمکدار چیز کے عکس کی وجہ سے نورانی ہو رہی تھی۔ یہ ریڈیم تھا۔ میجر کو تعجب ہوا کہ پروفیسر نے ایسی بیش بہا چیز کو کیوں اس طرح سے کھلا چھوڑ دیا۔ ظاہر تھا۔ کہ پروفیسر نے سائنس دانوں کے دکھانے کے لئے اسے یہاں رکھا تھا۔ لیکن

تین لاکھ چونسٹھ ہزار کا مال کھلے کمرہ میں میز پر رکھ دینا ایسی لغویت تھی جس کا ارتکاب پروفیسر
کے سوا دوسرا کرتا۔ تو اول درجہ کا پاگل سمجھا جاتا۔ لیکن یہ ایسا وقت نہ تھا۔ کہ میجر براؤن پروفیسر
کے قوائے ذہنی کی صحت و عدم صحت پر کھڑا ہوا غور کیا کرتا۔ چنانچہ وہ میز کی طرف بڑھا۔ لیکن
دہلیز کے اندر قدم رکھا ہی تھا۔ کہ دروازے کے پٹ بڑے زور سے بند ہوئے۔ میجر حیران
ہوا۔ کہ دروازہ کیسے بند ہوا۔ کیونکہ نہ ہوا تھی نہ کوئی شخص موجود تھا جس نے دروازہ بند کیا
ہو۔ کچھ دیر تک محو حیرت رہنے کے بعد وہ دروازہ کی طرف بڑھا۔ کہ پٹ پھر کھول دے۔ اور
گھنڈی گھما کر کھینچا لیکن معلوم ہوا کہ دروازہ مقفل ہے۔ اُس نے گھنڈی کو ہر طرف گھماتا دبانا اور
کھینچنا شروع کیا۔ مگر بے سود چٹخنیوں کو ٹٹولا۔ کہ بند ہونے کے دھاکے سے پیچھے والی چٹخنی
کہیں گر نہ گئی ہو۔ لیکن چٹخنی چڑھی ہوئی تھی۔ اُس نے دروازہ کو پھر اچھی طرح سے دیکھنا شروع
کیا۔ سوائے اُس گھنڈی کے جسے وہ ہر طرف گھما چکا تھا۔ اور اُس چٹخنی کے جسے وہ دیکھ چکا
تھا۔ کہ چڑھی ہوئی ہے۔ اور کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے دروازہ بند ہو سکتا۔ نہ کنجی کا سوراخ
تھا۔ نہ حلقے تھے۔ جن سے معلوم ہو کہ دروازہ مقفل ہے۔ میجر نے خیال کیا۔ کہ ضرور ہے۔ کہ کمرہ
سے نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ ہو۔ اس خیال سے اُس نے ادھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ مگر کوئی
کھڑکی یا دروازہ یا روشن دان نظر نہ آیا۔

تب تو میجر بہت ہی سٹ پٹایا۔ اور دل میں کہنے لگا۔ "بُرے پھنسے! خدا ہی ہے جو ہمارا
یہاں سے رہائی ملے۔ اور یہ سب میری بیوقوفی۔ مجھے چاہئے تھا۔ کہ دروازہ کی طرف سے اطمینان
کر لیتا تب اندر گھستا۔ افسوس کہ مجھ جیسا آدمی جو شاہی گارڈ کا میجر ہو۔ اور پارلیمنٹ کا ممبر ہو۔ وہ
معمولی چوروں کی طرح اقدام نقب زنی میں چالان کیا جائے۔

اس خیال سے اُس کا دماغ چکرانے لگا۔ اور بدن میں رعشہ پڑ گیا۔ اس پر اُسے اور
غصہ آیا۔ اور دل میں سوچنے لگا۔ کہ میں اس سے زیادہ خطروں میں مبتلا ہو چکا ہوں۔ لیکن
کبھی مجھے ایسی گھبراہٹ نہ ہوئی جیسی اس وقت ہے۔ وہ انہیں خیالات میں مستغرق

تھا۔ کہ دفعتہً گھنٹی بجی۔ جسے سنتے ہی وہ چونک پڑا۔ پیچھے پھر کے دیکھا۔ تو کمرہ کے کونے میں ٹیلیفون لگا ہوا پایا۔ جس کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اس نے اُس کے رہے سہے اوسان جاتے رہے۔ جب گھنٹی بجنی موقوف ہی نہ ہوئی۔ تو بمجبوری وہ ٹیلیفون کے پاس گیا۔ اور کان لگا کر سننے لگا۔ آواز آئی "کون ہے؟" میجر نے کچھ جواب نہ دیا۔ دوبارہ آواز آئی "کون ہے؟" میجر پھر بھی چپ ہی رہا۔

آواز "اگر جواب نہ دو گے تو ابھی پولیس کے سپاہی کو بلا کر تمہیں گرفتار کر دیا جائے گا۔"

میجر (یہ دیکھ کر کہ اگر جواب نہ دیا۔ تو پولیس کا سپاہی آ کر حقیقت میں ہتھکڑی ڈالے گا) "کہو کیا کہتے ہو۔"

آواز "خوب! کہو کیسے ہو؟"

میجر "بڑے مزے میں ہوں۔ کیا آپ ڈاکٹر ہیں؟"

آواز "تمہارا نام کیا ہے؟"

میجر (یہ خیال کرکے کہ صحیح نام بتانا ٹھیک نہیں) "رچرڈ مارکھم۔"

آواز "تمہارا نام کیا ہے؟"

میجر (یہ یقین کرکے کہ یہ حضرت کوئی بیمہ کمپنی کا ڈاکٹر ہے جو اُسے پروفیسر ملینہ کا نائب سمجھ کر یہ باتیں پوچھ رہا ہے) "میری عمر تو جو کچھ ہے وہ ہے مگر یہ تو فرمائیے۔ کہ یہ آدھی رات کے وقت آپ کو اپنی معلومات میں اس اضافہ کی کیا ضرورت ہے؟"

آواز (میجر کے سوال پر مطلق التفات نہ کرکے) "آپ کی عمر؟ جلدی کیجئے۔"

میجر "پینتیس سال (اپنے دل میں) ایسے اڑے وقت میں سچ کے سوا چارہ نہیں۔"

آواز "رچرڈ مارکھم۔ عمر پینتیس سال۔ پیشہ؟"

میجر "سپہگری۔"

آواز "بہت ٹھیک۔ رچرڈ مارکھم۔ عمر پینتیس سال۔ پیشہ سپہگری ابھی تک ملازمت میں ہیں یا پنشن

...ا ہے؟"

مینیجر:"پنشن پاتا ہوں"۔

آواز:"اچھا تو سُنئے۔ رچرڈ مارکھم۔ عمر پینتیس سال پیشہ سپہگری۔ حال پنشن یاب مگر آپ کس قدر بیوقوف ہیں کہ ریڈیم کے ایک ٹکڑے کی خاطر اپنے پیشہ کو دھبہ لگاتے ہیں اور پنشن سے ہاتھ دھوتے ہیں"۔

مینیجر (شرمندہ اور متحیر ہو کر) "کیا کہا؟"

پروفیسر:"میں نے یہ عرض کیا کہ ریڈیم کے ایک ٹکڑے کی خاطر آپ اپنی پنشن کے پیچھے کیوں پڑتے ہیں؟"

مینیجر:"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم بک کیا رہے ہو"۔

پروفیسر:"بہت اچھا۔ میں کوشش کروں گا کہ زیادہ وضاحت سے کام لوں۔ جناب والا آپ ...یں۔ آیا خیال شریف میں؟ آپ ریڈیم چرانے آئے تھے لیکن پروفیسر لبھّہ کے مکان میں بند ہو گئے"۔

مینیجر (گھبرا کر) "اب تو ہے کون؟"

آواز:"پروفیسر لبھّہ"۔

مینیجر:"لعنت بہ کار شیطان"۔

پروفیسر:"نہیں جناب بہ کار پروفیسر لبھّہ کہئے"۔

مینیجر:"آپ کہاں سے بات کر رہے ہیں؟"

پروفیسر:"میں برآمدے کے پہلو والے کمرہ میں ہوں۔ میں جس جگہ کھڑا ہوں وہاں سے آپ کے ...کا دروازہ نظر آتا ہے اور میرے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول ہے"۔

مینیجر:"آپ چاہتے کیا ہیں؟"

پروفیسر:"میری منشا کا انحصار آپ کے طرز عمل پر ہے"۔

مینیجر:"وہ کیسے؟"

پروفیسر:"وہ ایسے کہ آپ چاہیں تو آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔ اور چاہیں

تو مجھے سائنس کے انکشافات میں مدد دیں۔ کہئے کیا صلاح ہے؟"

میجر" یہ سائنس کے انکشافات کیا بلا ہوتے ہیں؟"

پروفیسر" آپ ایک بارہ فٹ مربع کمرہ میں مقید ہیں جس میں ایک تولہ ریڈیم رکھا ہوا ہے۔"

میجر" اچھا پھر"

پروفیسر" پھر یہ کہ آپ دنیا میں پہلے آدمی ہیں جو اتنی قلیل الحجم جگہ میں اتنے کثیر المقدار ریڈیم کے ساتھ بند ہوئے۔ اس لئے آپ کے محسوسات سائنٹیفک دنیا میں بہت گراں بہا سمجھے جائیں گے۔ اس لئے اگر آپ اس وقت تک جب تک آپ کے ہوش و حواس بجا رہیں۔ اپنے محسوسات سے مجھے بذریعہ ٹیلیفون اطلاع دیتے رہنے کا وعدہ کریں۔ تو خیر ورنہ ابھی پولیس کو بلاتا ہوں۔ ان دونوں میں سے آپ کونسی بات پسند کرتے ہیں۔"

میجر" آپ کا شکریہ۔ کہ آپ نے یہ معاملہ میری رائے پر چھوڑا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے محسوسات بیان کرکے آپ کے علم میں اضافہ کروں۔"

پروفیسر" جناب رچرڈ مارکھم صاحب میں آپ کا نہایت ہی شکرگزار ہوں۔ لیکن آپ کو پہلے سے متنبہ کئے دیتا ہوں کہ آپ کو جسمانی تکلیف بہت کچھ برداشت کرنی پڑے گی۔ میرا تجربہ کئی گھنٹے سے پہلے ختم نہ ہوگا۔ اور چاہے آپ کو کتنی ہی تکلیف محسوس کیوں نہ ہو یہ ناممکن ہے کہ دورانِ تجربہ میں کمرہ کھول کر آپ کو نکل جانے دوں۔ کہئے آپ راضی ہیں یا پولیس۔"

میجر (جلدی سے بات کاٹ کر)" میں تو کہہ چکا ہوں۔ کہ پولیس کے مقابلہ میں مجھے آپ کا سائنس زیادہ عزیز ہے۔"

پروفیسر" نہایت مہربانی۔ ہاں یہ تو فرمائیے آپ کا قلب کیسا ہے؟"

میجر" نہایت زبردست۔ گھنٹہ کی طرح آواز دیتا ہے۔"

پروفیسر۔ نہایت ہی خوب۔ اس قسم کے تجربہ کے لئے دل چاہئے بھی ایسا ہی۔"

میجر (دل میں)" یا اللہ۔ بُرے پھنسے (پروفیسر سے مخاطب ہوکر) آپ کو کچھ اور پوچھنا ہے؟"

پروفیسر: "بہت کچھ۔ گھڑی ہے؟"

میجر: "ہاں ہے"

پروفیسر: "آپ ضربات نبض بتا سکتے ہیں؟"

میجر: "بیشک"

پروفیسر: "جناب والا آپ تو موتیوں میں تولنے کے قابل ہیں۔ میں نہایت ہی ممنون ہوں کہ آپ نے آدھی رات کو غریب خانہ میں قدم رنجہ فرمایا۔ اس کمرہ میں آپ کو بند ہوئے پندرہ منٹ تیس سکنڈ ہو چکے ہیں۔ اب بتائیے آپ کی نبض کی رفتار کیا ہے؟"

میجر: "بہتر"

پروفیسر: "نہایت مہربانی۔ کیا آپ مقیاس الحرارت کا استعمال جانتے ہیں؟"

میجر: "بیشک"

پروفیسر: "بہت خوب ٹیلیفون کے ڈھکنے پر کاغذ کے پاس ایک نلکی رکھی ہے۔ اس میں سے مقیاس الحرارت نکال لیجئے اور نہایت احتیاط سے بتائیے کہ پارہ کس درجہ پر ہے؟"

میجر: "ستانوے"

پروفیسر: "نہایت مہربانی۔ بہت بہت شکریہ۔ مجھے خیال نہیں تھا۔ کہ فوج میں ایسے سمجھ دار لوگ بھی ہوتے ہیں۔ اخبار بھی لوگوں کو کس قدر دھوکا دیتے ہیں۔ کہ اس کے خلاف ظاہر کرتے ہیں۔ اب آپ مقیاس الحرارت کو دو منٹ تک اپنی زبان کے نیچے رکھئے اور اس کے بعد مجھے بتائیے کہ پارہ کتنے درجہ اوپر چڑھا"

میجر (منٹ کے بعد) "ستانوے"

پروفیسر: "بہت بہت مہربانی۔ آپ رسالہ میں تھے یا پیدلوں میں"

میجر: "رسالہ میں"

پروفیسر: "رسالہ میں؟ بہت بہت مہربانی۔ آپ کی شادی ہو چکی ہے؟"

میجر: "نہیں"۔

پروفیسر: "تب تو کیا ہی کہنے ہیں۔ آپ کو دردِ سر کی شکایت تو نہیں؟"

میجر: "ابھی تک تو نہ تھی۔ لیکن آپ کے ان مسلسل سوالات کی عنایت سے تھوڑی
یر میں ضرور ہو جائے گی"۔

پروفیسر: "آپ مہربانی فرما کر صرف علامات ہی بتائے جائیے تشخیص کا کام اس خاکسا
ے سپرد کر دیجیے۔ آپ کے قلب کی حرکت کی کیا کیفیت ہے؟"

میجر: "خوب زور سے دھڑک رہا ہے؟"

پروفیسر: "ابھی کیا۔ آگے چل کر دیکھیے گا کہ کیسا دھڑکتا ہے۔ تنفس کیسا ہے؟"

میجر: "دم گھٹا جاتا ہے۔ اگر آپ مجھے تازہ ہوا کھانے کے لئے ایک منٹ کو باہر آنے
یں۔ تو بڑی عنایت ہو گی"۔

پروفیسر: "نہ حضرت تازہ ہوا کو ابھی اپنے تنفس سے زیر بار فرمانے کا خیال دل میں نہ لائیے
ربہ ختم ہونے سے پہلے آپ کا باہر تشریف لانا ناممکنات میں سے ہے۔ فوج والوں کے ذی
ش ہونے کے متعلق جو رائے میں نے قایم کی تھی عجب نہیں کہ آگے چل کر وہ غلط ثابت ہو۔ کوئی عقلمند
ص دوران تجربہ میں اس قسم کی خواہش کا اظہار نہیں کر سکتا۔ اچھا بالفعل کچھ دیر کے لئے میں اپنے
الات ملتوی کرتا ہوں۔ تھوڑی دیر میں پھر گھنٹی بجاؤں گا۔ اگر آپ کو مجھ سے کچھ ارشاد کرنا ہو۔
ں یہیں حاضر ہوں۔ اس عرصہ میں آپ تھوڑی سی چہل قدمی کرکے تازہ دم ہو جائیں گے"۔

میجر ٹیلیفون کے پاس سے ہٹ گیا۔ کمرہ کی ہوا بہت ہلکی ہو گئی تھی۔ ریڈیم کی شعاعیں
یادہ تیز اور چمکدار ہو چلی تھیں۔ جب وہ اس کی طرف بڑھا۔ تو اسے ایک فوری بے چینی محسوس
ئی جس طرح دہکتی ہوئی آگ کے سامنے جسم کو برہنہ کرنے سے جلن معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح
ے ریڈیم کی طرف بڑھتے وقت ایسا معلوم ہوا۔ کہ اس کے جسم کے سامنے کا حصہ آگ میں
لس گیا ہے۔ سانس بھی رک رک کر آنے لگی۔ دردِ سر بھی معلوم ہونے لگا۔ وہ فوراً پیچھے

ہٹ کر دیوار کے ایک کونے میں جا کھڑا ہوا۔ میز سے علیحدہ جا کھڑے ہونے سے ان علامتوں کی سختی کم ہو گئی۔ اتنے میں گھنٹی پھر بجی۔ اور پروفیسر کی آواز آئی۔

"مناسب ہو گا کہ میں آپ کو متنبہ کر دوں۔ کہ اگر آپ ریڈیم کو ضائع کرنے کی کوشش کرینگے تو اس سے کچھ فائدہ نہ ہو گا۔ اگر آپ نے ریڈیم کے ٹکڑے کو توڑ دیا۔ یا کچل ڈالا تو اور بھی مضر ہو گا کیونکہ اُس حالت میں اس کے ذرّات منتشر ہو کر آپ کے جسم میں نفوذ کر جائیں گے۔ اُس وقت جو کیفیت آپ کو محسوس ہو گی۔ وہ نہایت ہی دلچسپ ہو گی۔ بشرطیکہ آپ اُس کا تجربہ کرنا چاہیں لیکن نتیجہ کا ذمہ دار میں نہ ہوں گا۔ بہرحال اتنا میں آپ کو سمجھائے دیتا ہوں۔ کہ آپ اس نئے زبردست عنصر سے اُس حالت میں کسی طرح بچ نہیں سکتے۔ جب کہ آپ اس کے ساتھ ایک کمرہ میں بند ہیں۔ خصوصاً جب کہ وہ کمرہ صرف بارہ فٹ مربع ہے"

بیچارے میجر نے اس کا جواب کچھ نہ دیا۔ ٹیلیفون کے تار کے دوسرے سرے پر پروفیسر رابرٹ بلیتھ فیلو آف دی رائل سوسائٹی۔ ڈاکٹر آف سائنس کھڑے تھے۔ جن کی تحقیقات و اکتشافات نے علمی دنیا میں ہلچل ڈال دی تھی۔ عام طور سے پروفیسر نہایت متین اور سنجیدہ شخص تھا۔ اور اپنے اندرونی جذبات کو کبھی شکل سے ظاہر نہ ہونے دیتا تھا اور اُس کے دوست کہا کرتے تھے۔ کہ پروفیسر کے چہرہ پر سوائے اُس حالت کے جب کہ وہ کوئی تجربہ کامیابی کے ساتھ کر رہا ہو۔ خوشی کے آثار اور کبھی نہیں پائے جاتے۔ یہ قول بالکل صحیح تھا۔ کیونکہ اس وقت وہ چرچ وارڈ کھم سابق ملازم رسالہ شاہی و حال مقید کمرہ پروفیسر موصوف کے بیان کردہ تجربوں کو (جسے انہوں نے قلمبند کر لیا تھا) پڑھ پڑھ کر باغ باغ ہوئے جاتے تھے۔ پڑھتے تھے۔ اور خوش ہوتے تھے۔ کہ سائنس کی دنیا میں کس قدر اضافہ ہوا اور جوش مسرت میں پھر پڑھتے تھے۔

"نبض کی رفتار ۷۳۔ حرارت غریزی ۹۹۔ قلب کی حرکت بے قاعدہ نہایت ہی عمدہ نتائج ہیں۔ سانس رک رک کر آتی ہے۔ یہ بھی قرین قیاس ہے۔ کیونکہ اسے مقید

ہوئے ۳۱ منٹ گذر چکے جسم مضبوط ہے۔ اسی لئے ابھی تک کچھ زیادہ تکلیف محسوس نہیں ہوئی لیکن اب تھوڑی دیر میں دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ جناب رچرڈ مارکھم۔ آج تو آپ بے طرح پھنسے۔ اگر آپ مجرم نہ ہوتے۔ تو میں آپ کو اس بلا میں پھنساتے ہوئے جھجکتا لیکن حالت موجودہ تو آپ کو سائینس کی راہ میں ضرور ہی یہ مصیبت جھیلنی چاہئے۔ اگر آج کا تجربہ آپ کے ذہن عالی سے اتر نہ گیا۔ تو عمر بھر چوری نہ کیجئے گا۔

"حقیقت میں یہ بات عجائبات قدرت سے ہے۔ کہ عقل ہمیشہ مادہ پر غالب آتی ہے کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے۔ کہ رچرڈ مارکھم جیسا قوی ہیکل اور زبردست آدمی مجھ جیسے ضعیف نحیف شخص کے ایک اشارہ سے برابر والے کمرہ میں اس طرح بند ہو جائے جس طرح چوہا چوہے دان میں بند ہو جاتا ہے۔ میں نے اپنی تحقیقات کا اشتہار اخباروں میں دے کر اپنی کمال دانشمندی کا ثبوت دیا۔ آجکل جتنے جرائم پیشہ لوگ ہیں سب اخبار پڑھتے ہیں۔ میرا یہ خیال صحیح تھا۔ کہ اس اشتہار پر ضرور کسی چور کی نظر پڑے گی۔ اس کے بعد میں نے ریڈیم کو کمرہ کے وسط میں رکھ دیا۔ اور مقابل والی دیوار پر سلفائڈ آف زنک مل دیا۔ تاکہ چور کو ریڈیم ڈھونڈنے ذرا بھی وقت نہ ہو۔ اب ایسی دہلیز کا تیار کرنا جس میں سے گزرتے ہی دروازہ کھٹ سے بند ہو جائے۔ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ پس اب اس کے بعد اس کا انتظار تھا۔ کہ چور آئے اور جال میں پھنسے ہو کر رہا۔"

اس وقت گھنٹی بجی۔ پروفیسر فوراً آرام کرسی پر سے اٹھا۔ اور ٹیلیفون کے پاس جا کر کہنے لگا

"رچرڈ مارکھم صاحب! کیا آپ کی بے چینی بڑھنے لگی؟ فرمائیے کیا ارشاد ہے۔"

میجر "کیا تم حضرت یسوع مسیح کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہو؟"

پروفیسر "کہتے تو ایسا ہی ہیں۔ مگر اس سوال سے آپ کا مطلب؟"

میجر "جو شخص مسیح پر ایمان رکھتا ہو۔ اور بہشت میں جانے کا آرزو مند ہو۔ کیا وہ ایسی حرکت کا مرتکب ہو سکتا ہے کہ مجھے اس کمرہ میں بند کر کے دوزخ کی آگ کا نمونہ میرے سامنے

رکھ دے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ میں اس آگ میں کباب ہوا جا رہا ہوں۔ اس کا زہر میرے جسم میں پھیل رہا ہے۔ اس کے ابخرے میرا دم گھونٹ رہے ہیں۔ اس کا اثر میرے دماغ پر چھایا جا رہا ہے۔ اگر تم عیسائی ہو۔ تو کمرہ کو کھول دو اور مجھے باہر نکلنے دو۔"

پروفیسر:۔ "آپ اپنے دماغ کو بیفائدہ تکلیف کیوں دے رہے ہیں۔ آپ کو کوئی حق نہیں ہے کہ تجربہ ختم ہونے سے پہلے باہر نکلنے کا نام لیں۔ چونکہ آپ چور ہیں۔ اس لئے آپ کو قرار واقعی سزا بھگتنی چاہئے۔ اور آپ تو فوج میں ملازم رہ چکے ہیں۔ بیسیوں لڑائیاں لڑی ہوں گی۔ خون کے نالے بہتے گولوں کے مینہ برستے دیکھے ہوں گے۔ تھوڑی دیر کے لئے سمجھ لیجئے۔ کہ وہی ہنگامہ برپا ہے آپ نہیں سمجھ سکتے۔ کہ آپ کی تھوڑی دیر کی تکلیف سے بنی نوع انسان کو کس قدر فائدہ پہنچے گا میں آپ کی اس تکلیف کا حال نمک مرچ لگا کر برٹش میڈیکل جرنل میں شائع کر دوں گا۔ اور مجھے یقین کامل ہے کہ آپ کے خویش و اقارب جب اسے پڑھیں گے تو آپ کی ذات پر فخر کریں گے۔"

میجر:۔ "میں خویش و اقارب سب کو پانی دے چکا ہوں۔ اور اگر کوئی ہوتا بھی تو تیری اس بکواس کو نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ دروازہ کھولنا ہے تو کھول۔ نہیں تو میں کوئی ایسی بات کر گزروں گا کہ تو عمر بھر پچھتائے گا۔"

پروفیسر:۔ "حضرت اس کی طرف سے اطمینان رکھئے۔ کمرہ میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کی طرف سے اندیشہ ہو۔ ریڈیم ہے۔ سو اس کے توڑنے سے آپ کی جان پر ہی بن جائے گی۔ باقی رہا شیشہ اس کے ضائع کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ بیرونی دنیا سے جو رہا سہا تعلق آپ کا ہے۔ وہ بھی منقطع ہو جائے گا۔ آپ ہمت کیوں ہارے جاتے ہیں۔ کلکتہ کے بلیک ہول والے واقعہ کا ذکر تو آپ نے پڑھا ہی ہوگا۔ ان بیچاروں کی حالت تو آپ سے زیادہ خراب تھی۔"

میجر:۔ "تیری اور تیرے بلیک ہول کی ایسی تیسی۔ رہ تو جا ملعون۔ خبیث۔ پاجی۔ اگر جیتا بچا۔ تو تیری ہڈیاں چور چور نہ کر دی ہوں تو نام نہیں۔"

پروفیسر۔ "جناب عالی! آپ اس قدر گرم کیوں ہوتے ہیں۔ مزاج درست رکھئے کمرہ میں

چل قدمی کیجئے۔ انشاء اللہ طبیعت جلد بحال ہو جائے گی۔ ہاں تھرامیٹر پھر زبان کے نیچے رکھ
رکھے بتاتے۔ کہ پارہ کتنے درجہ پر ہے۔ سائنس کی کچھ نہ کچھ خدمت بجا لاتے رہئے۔ بیکار رہنا ٹھیک
نہیں۔ (دل میں) بچا کو اب تو چھٹی کا دودھ یاد آگیا ہوگا۔ اگر پانچ سنٹی گرام ریڈیم کلورائیڈ سے آٹھ
چوہے تین دن میں مرجاتے ہیں تو ایک تولہ ریڈیم برومائیڈ ایک مضبوط آدمی کو کتنی دیر میں بیہوش کر
سکے گا۔ اربعہ متناسبہ کا یہ سوال کئی دن سے حل طلب تھا۔ اب وہ وقت آگیا۔ کہ کوئی شخص اس
کو حل کرے اور وہ شخص پروفیسر بلیتھ ہوگا۔"

کچھ دیر میں گھنٹی بجی اور آواز آئی:۔

"حرارت غریزی ۱۰۲ نبض ۱۰۰۔ ارے او پاپی پروفیسر خدا کے لئے اب تو مجھ پر رحم کر۔
مسیح کی خاطر نہیں تو کم از کم اس خیال سے چھوڑ دے کہ تو بھی بال بچوں والا ہے۔"

پروفیسر میجر کی بات سنی ان سنی ایک کر کے "نبض ۱۰۰۔ غالباً ناہموار ہو گی۔"

میجر "اپنی ہی کہے جاتا ہے میری ایک نہیں سنتا۔"

پروفیسر "رچرڈ وارکھم صاحب از برائے خدا انصاف کیجئے۔ کہ جو قرارداد مجھ میں آپ میں ہوا
تھا۔ اُس کے لحاظ سے آیا یہ مناسب ہے کہ ایسی حالت میں جبکہ تجربہ سے خاطر خواہ نتائج مستنبط ہو
رہے ہیں۔ آپ اپنی رہائی کے لئے زور دیں۔ اور تجربہ کو آخر تک پہنچانے سے پہلو تہی کریں۔ اگر
علمی دنیا پر احسان نہیں کرنا چاہتے۔ تو کم از کم ایفائے عہد ہی کے خیال سے اپنی بات پر قائم
رہئے۔ ہاں تو کیا آپ کی نبض ناہموار ہے؟"

میجر "ہاں ہے تو لیکن میرے ہاتھ بھی کھجلا رہے ہیں کہ تیری چاند گنجی کر دیں۔ پروفیسر بلیتھ یاد رکھ
اگر آج میرا دم نکل گیا۔ تو خبیث بن کر تجھے اور تیرے گھر بھر کو پانچویں پشت تک کھا کھا جاؤں گا۔ دیکھ لینا تو
گل ہو کر بھونک بھونک کر کتے کی موت مرے گا۔ کھول کواڑ۔ او پاجی گدھے . . . " یہ گالیاں سن کر پروفیسر
ٹیلیفون سے ہٹ گیا۔ اور اپنی مختصر سی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگا۔

"ادنے درجہ کے ارذل و انفار کی خاص خصوصیت ہے۔ کہ سختی کے وقت گن ۔

ل ہو جانے میں مجھ پر خواہ کیسا ہی وقت کیوں نہ آپڑے۔ ممکن کیا کہ پایۂ تہذیب اور درجۂ
ہت سے گرا ہوا کوئی لفظ میری زبان سے ادا ہو۔ شرافت خاندانی اور اعلیٰ تعلیم کے
ا تو جوہر ہیں۔ لیکن رچرڈ مارکھم نے میرے استفسارات کا جواب جس تشفی بخش طریقہ سے
ہے نہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم اچھی پائی ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ آخر میں شرافت
انی بازی لے جاتی ہے۔"

یہ کہہ کر پروفیسر نے بڑے فخر سے پھر اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ کچھ دیر گزرنے کے بعد
فیسر نے اس خیال سے کہ اس کے قیدی کی حالت ضرور متغیر ہونی شروع ہوئی ہوگی۔
ا بجائی لیکن جواب نہ ملا۔ پروفیسر نے دل میں کہا۔ کہ یہ تو ہو نہیں سکتا۔ کہ ایک ۲۵
ل کا جوان سپاہی ایسی جلدی بیہوش ہوگیا ہو ضرور ہے کہ وہ کمرہ میں چہل قدمی کر رہا ہو۔ یہ
چ کر اس نے پھر گھنٹی بجائی۔ اس دفعہ آہستہ سے جواب آیا۔ جسے سن کر پروفیسر نے کہا:۔

"جناب آپ نے پہلے جواب کیوں نہ دیا؟"

میجر:۔ جیسے میں تیرے باپ کا نوکر ہوں۔ میں یہ سوچ رہا تھا۔ کہ اگر تو میرے ہاتھ آجائے
ے کن عذابوں سے ماروں۔ اب سنتا ہے کہ نہیں۔ اس آگ کو دیکھتے دیکھتے میری آنکھیں
چلیں۔ اب تو میری روح تحلیل ہوئی جاتی ہے۔ اب مجھے پولیس وولیس کی کوئی
یں۔ تیرا جی چاہے تو گرفتار کرا دے۔"

روفیسر:۔ جناب عالی آپ کی گفتگو پایۂ ثقاہت اور درجۂ تہذیب سے گری ہوئی ہے
پ کے اس اشتعالِ طبع پر رہ رہ کر تعجب ہوتا ہے۔ آپ جیسا جوان اور بچوں کی طرح بگڑ
ول کی طرح چڑے۔ اب تو میں پولیس کو بلانے سے رہا۔ آپ نے وعدہ کیا تھا۔ کہ یہ تجربہ
ہنچا دیں گے اور ایفائے وعدہ آپ کا فرض ہے۔ اب کہئے نبض کی کیا رفتار ہے؟"

میجر:۔ ایک سو بیس ہے گھڑی کی طرح ٹک ٹک چل رہی ہے۔ اور کوئی تعجب نہیں۔
ہیں گھنٹے کی طرح ٹن ٹن کرنے لگے۔"

پروفیسر "ہمت نہ ہاریئے۔ آپ کے ہاتھوں کی رنگت نیلی ہے؟"

میجر "نیلی تو نہیں سبز ہے؟"

پروفیسر "سبز! ناممکن ہے"

میجر "ممکن ہو کہ حقیقت میں نیلی ہو۔ کیونکہ میری نگاہ خراب ہے۔ رنگوں میں امتیاز نہیں کر سکتا"

پروفیسر "سپاہی ہو کر آپ کی بصارت ایسی ضعیف ہو باعث تعجب ہے۔ شاید آپ کے ہاتھ سیلے ہوں گے اس درجہ سے نیلاہٹ بس ہریالی معلوم ہوتی ہوگی۔ آپ کی انگلیوں میں درد تو نہیں ہے؟"

میجر "نہ صرف ہاتھ بلکہ پاؤں کی انگلیوں میں بھی ٹیسیں اٹھ رہی ہیں"

پروفیسر "مرحبا! اور حرارت عزیزی؟"

میجر "۱۰۳۔ ارے میں گرمی کے مارے بھنا جاتا ہوں۔ کیا تو نے مجھے مار ہی ڈالنے کی ٹھانی ہے؟"

پروفیسر "ابھی کل ہی سوا گھنٹہ ہوا ہے۔ اُس پر یہ شور برپا کر دیا۔ کہ الاماں ابھی تو تجربہ کی ابتدا ہے" یہ کہہ کر پروفیسر برآمدہ میں ٹہلنے اور اپنے دل سے باتیں کرنے لگا۔

"کاش! کنٹرب یہاں موجود ہوتا۔ میں ثابت کر کے اُس سے منوا لیتا۔ کہ اُس کی یہ رائے کل غلط ہے کہ ریڈیم کے اثر سے خون کے کارپسل آکسیجن سے خالی ہو کر بیہوشی کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ میں علمی دنیا کے سامنے اب یہ اصول پیش کر سکوں گا۔ کہ ریڈیم کے فعل سے اعصاب متاثر ہوتے ہیں اور معمول مفلوج ہو جاتا ہے۔ کنٹرب بیوقوف ہے۔ اپنی ضد پر اڑا رہا اُسے میری بات ماننی پڑے گی"

اتنے میں پھر گھنٹی بجی اور میجر کی آواز آئی۔

"پروفیسر! اچھی طرح سُن۔ اگر تو نے فوراً دروازہ نہ کھول دیا تو میں یہ ریڈیم نگل جاؤں گا تاکہ بیچارہ رہ جائے گا۔ ریڈیم نگل لینے سے میری حالت اس سے تو خراب ہونے سے رہی۔ اس وقت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جس قدر جلد میرا دم نکل جائے اچھا ہے . . ."

پروفیسر "آپ احمق نہ بنیے جو تکلیف آپ کو اس وقت ہو رہی ہے۔ اُس میں

دی ہو جائے گی۔"

میجر: "کچھ پروا نہیں۔ ہیں . . . ."

پروفیسر ٹیلیفون بند کر کے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا اور دل میں کہنے لگا:۔

"اس شخص نے تو مجھے مایوس کر دیا۔ خدا ہی ہے جو تجربہ حسب مراد ختم ہو۔ یہ شخص تو
ی بہت ہار گیا۔ آخر ذیل ہے نہ۔ محض گوشت و خون کا تودہ کیا کر سکتا ہے۔ جب تک
ت وعلم نہ ہو۔"

کچھ دیر کے بعد پروفیسر نے پھر گھنٹی بجائی۔ لیکن اس دفعہ جو جواب اُسے ملے۔ اُن سے
م ہوتا تھا۔ کہ قیدی کا دماغ چل گیا۔ جو آوازیں پروفیسر کے کان میں رُک رُک کر آئیں
یہ تھیں:۔

"بلبھ کے سر پر تلی ناچی۔ اسوار گھوڑا دوڑائے کدھر جاتا ہے۔ برف گر رہی ہے۔
پیاپنا ہوا سڑک پر لڑھک رہا ہے۔"

پروفیسر: "مارکھم صاحب خدا کے واسطے حواس بجا رکھئے۔ مجھے ابھی بہت دیر تک
ربہ کرنا ہے۔ آپ کے اختلال حواس سے میرا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔"

میجر: "ہا ہا ہا۔ اوہو ہو ہو۔ سوار تلواریں کھینچ کر بڑھو۔ اور دشمن کو کاٹ ڈالو۔ یور-
نی اور روسی گلے مل رہے ہیں۔ شاباش میرے بہادرو۔ گھر کو پلٹ چلو۔ . . . .
. . واہ رے میں۔ تلوار سے ایک سارجنٹ میجر کے دو ٹکڑے کر دیئے۔"

اس کے بعد ٹیلیفون میں قہقہوں کی آوازیں آنے لگیں جنہیں سن کر پروفیسر نہایت
دہ ہوا۔ تجربہ کے اس طرح رُک جانے سے اُس کی خوشی خاک میں مل گئی۔ کچھ دیر کے بعد
نے گھنٹی بجائی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے تھوڑی دیر بعد پھر گھنٹی بجائی
ن جواب نہ ملا۔ آخر پروفیسر نے غمزدہ آواز میں کہا۔

"اب دروازہ کھولنا ہی چاہئے۔ یہ شخص بیہوش پڑا ہوا ہے اور اس حالت میں

اگر دیر تک ریڈیم کی شعاعوں کے سامنے رہا۔ تو ممکن ہے کہ نتیجہ اچھا نہ ہو۔"
یہ کہہ کر اُس نے دروازہ کھولا۔ کمرہ میں اندھیرا تھا۔ پروفیسر سخت متعجب ہوا۔ اور دل میں کہنے لگا۔

"یہ ریڈیم کہاں غائب ہو گیا؟ کہیں حقیقت میں نکل ہی تو نہیں گیا؟ آگے بڑھ کر اُس نے چاہا کہ بٹن دبائے۔ تاکہ کمرہ میں بجلی کی روشنی ہو جائے۔ اُس نے قدم اندر رکھا ہی تھا۔ کہ دروازہ بڑے زور سے بند ہو گیا۔ پروفیسر نے کمرہ روشن کر کے چاروں طرف نظر ڈالی مگر نہ قیدی تھا نہ ریڈیم۔ اس وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور آواز آئی۔

"کیا جناب کمرہ میں تشریف رکھتے ہیں؟"

پروفیسر (محو استعجاب ہو کر) "مارکھم تم ہو؟"

آواز "جناب والا ہاں۔ خاکسار حاضر ہے۔ آپ کی عمر کیا ہے؟"

پروفیسر "تمہارا سر ہے۔"

میجر "جناب پروفیسر صاحب برہم نہ ہوجئے۔ آپ کی حرارت غریزی کتنے درجہ ہے؟ قیاس الحرارت ٹیلیفون کے پاس ہے۔ براہ کرم زبان کے نیچے لگائیے۔ اور جیب سے گھڑی نکال نبض کی رفتار بھی بتائیے۔"

پروفیسر "نابکار۔ ملعون۔ چور۔ بدمعاش تو ہمارا مذاق اڑاتا ہے؟"

میجر "جناب عالی آپ کی گفتگو پایۂ ثقاہت اور درجۂ تہذیب سے گری ہوئی ہے۔"

پروفیسر "ابے او پاجی سنتا ہے کہ نہیں۔ اگر تو نے فوراً دروازہ نہ کھول دیا۔ تو میں تجھے پولیس کے حوالے کر دوں گا۔"

میجر "جناب عالی پولیس یہاں کہاں۔ سوائے اس خاکسار کے اور یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔"

پروفیسر "ابے تو نے میرا ریڈیم کیا کیا؟"

میجر "جناب والا۔ ریڈیم نہایت حفاظت سے میری جیب میں رکھا ہوا ہے۔ یہاں

آنے سے پہلے میں نے اس کے حالات خوب اچھی طرح پڑھ لئے تھے۔ ایک سیسہ کی چھوٹی سی ڈبیہ جس کے اندر سیسہ ہی کی ایک اور ڈبیہ بند تھی۔ اور دونوں کے فصل میں پارہ بھرا ہوا تھا میں اپنے ساتھ لیتا آیا تھا۔ جب آپ نے مجھے مقید فرمایا ہے۔ تو اُس کے کچھ دیر بعد میں نے ریڈیم کو اس ڈبیہ میں بند کر لیا تھا۔ اُس ڈبیہ کے باہر نہ اس کی شعاعیں نکل سکتی ہیں۔ نہ حرارت اثر کر سکتی ہے۔ میرا وقت آپ سے باتیں کرنے میں نہایت عمدہ طور پر صرف ہوا۔ میں جناب کو یقین دلاتا ہوں۔ کہ جناب کی خوشگوار باتیں مجھے عمر بھر نہ بھولیں گی۔"

پروفیسر "مارکھم تو اول درجہ کا چھٹا ہوا بدمعاش بے ایمان اور گستاخ ہے۔ مجھے جلد حراست سے نکال۔ ورنہ"

میجر "جناب عالی ناراض نہ ہوجئے۔ آپ نہیں سمجھ سکتے۔ کہ آپ کی تھوڑی دیر کی تکلیف سے بنی نوع انسان کو کس قدر فائدہ پہنچے گا۔ برٹش میڈیکل جرنل میں آپ کا جو مضمون طبع ہوگا۔ میں اُسے ضرور پڑھوں گا۔ اور اُس کی تردید میں ایک حرف بھی زبان سے نہ نکالوں گا اگرچہ میری نبض کی رفتار ۷۲ سے نہیں بڑھنے پائی۔ اور حرارت عزیزی ننانوے درجہ سے زیادہ نہ ہوگی۔ اگر میں آپ سے شرفِ مکالمت حاصل کرنے کے بجائے ریڈیم کو فوراً ڈبیہ میں بند کر لیتا تو اتنا بھی نہ ہوتا۔ لیکن جناب سے ایک فروگذاشت ضرور ہوئی۔ کہ دروازہ کھولتے وقت جناب نے یہ خیال نہ فرمایا۔ کہ جس بوتل کا آپ کاک کھول رہے ہیں۔ اُس میں اڑ جانے والا جوہر بند ہے۔ براہِ کرم کلکتے کے بلیک ہول کا تصوّر اپنے ذہن عالی میں رکھئے۔ اور مجھے وداع کہنے کی اجازت دیجئے۔ خدا حافظ *